ظرافت اور تنقید

احمد جمال پاشا

ظرافت اور تنقید

احمد جمال پاشا

یہ کتاب بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے

سلسلۂ کتب — بار دوم

نام کتاب :- ظرافت اور تنقید

تصنیف :- احمد جمال پاشا

سن اشاعت :- سنہ ۱۹۸۲ء

کتابت :- امتیاز احمد بستوی

مطبع :- نشاط پریس ٹانڈہ

تعداد :- ۱۰۰۰

سائز :- ڈیمائی ۱/۸

قیمت :- پچیس روپے

ملنے کا پتہ

پاشا اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، نشاط افزا، سیوان (بہار)

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر دہلی ۱۱۰۰۲۵

کتاب منزل، سبزی باغ پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

مکتبہ اطفال مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳ ناسک، مہاراشٹر

فہرست

پڑھنے والوں سے

"ظرافت اور تنقید" ظرافت پر میرے تنقیدی خیالات کا یہ اولین مجموعہ ہے اس کی اولیت اس اعتبار سے بھی قابل توجہ ہے کہ اردو کے طنزیہ مزاحیہ ادب پر یہ پہلا تنقیدی مجموعہ ہے کم از کم میری نظر سے اب تک کوئی ایسا تنقیدی مجموعہ نہیں گذرا ہے جس میں صرف ظرافت اور ظریفوں کو کھنگالا گیا ہو آپکی نظر سے یہ بھی نہ گذرا ہوگا

مزاح نگاری کے ساتھ ساتھ جنوں کی حد تک مزاحیہ ادب میں دلچسپی اب مجموعہ کی شکل میں پڑھنے والوں کے پیش خدمت ہے۔

ان مضامین کا سلسلہ ۱۹۵۰ء سے شروع ہوا تھا اور ۱۹۸۱ء تک ۳۰ سال کی طویل عرصہ میں مضامین کی تعداد سو سے اوپر ہو گئی۔ احباب نے جن میں بیشتر اردو کے معتبر و ممتاز ناقدین اصرار کیا کہ منتشر مضامین کو کتابی شکل میں یکجا کر دوں تو بہتوں کا بھلا ہو گا۔ مذکورہ مضامین سے چوتھائی کے قریب انتخاب کر کے انھیں پھر سے ٹھیک ٹھاک کیا اب یہ کتابی شکل میں آپکے سامنے ہیں۔

میں نے یہ نہیں کہا کہ ظرافت اور تنقید پر یہ پہلا صحیفہ ہے اس لیئے آپ سے یہ درخواست بیجا نہ ہو گی کہ اسے آپ پڑھیں اس کی خامیوں، کوتاہیوں اور غلطیوں کی نشاندہی، تبصرے، ذاتی خطوط یا ملاقات کے ذریعہ فرمائیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں آپکے شکریئے کے ساتھ انھیں دور کیا جاسکے

فن لطیفہ گوئی پہلی بار ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا دوسری بار اس کی مرتب کر کے ۱۹۶۰ء میں شائع کرایا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے بیشمار رسائل و اخبارات نے اسے نقل کیا تھا۔ اس سے فائدہ یہ ہوا کہ لطائف اور انکے فن پر پہلی بار توجہ کی گئی کیونکہ اس سے پہلے کسی نے اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا تھا اہل قلم نے پھر اس موضوع پر دلچسپی لی۔ اس مضمون نے خواجہ عبدالغفور جیسا ایک ماہر لطیفہ پیدا کر دیا۔ اور دوسری کاوشیں سامنے آئیں۔

شہرۂ آفاق ظریف" ملا نصیر الدین" بھی اسی طرح اہل ادب نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ملا پر اردو میں اس تحقیق کے ساتھ اس سے قبل کام کہاں ہوا تھا؟ تحقیق کیا ٹوٹا پھوٹا بھی نہ لکھا گیا تھا

"اودھ پنچ" اس کے ظریفوں اور منشی سجاد حسین میں خاص دلچسپی کا اظہار بہت سے مضامین میں کیا جا چکا ہے۔ ان میں سے "منشی سجاد حسین کی ظرافت" پیش خدمت ہے ——— باقی آئندہ تفصیل میں کیوں جاؤں

پتہ نو دیگ کے ایک ہی چاول سے چل جاتا ہے دوسرے مجھے جو بتانا تھا بتا چکا اب مجھے آپ سے سننا ہے آپکی قیمتی رائے کا اشتیاق اور انتظار رہے گا۔ تاکہ معلوم تو ہو سکے، کہ کتنے پانی میں ہوں۔ پانی میں ہوں بھی یا خشکی پر ہوں۔

کوٹھی "نشاط افزا"

(سیوان بہار)

احمد جمال پاشا

۲۵/اپریل سنہ ۱۹۸۲ء

ناخدائے نقد

کلیم الدین احمد

کی نذر

فن لطیفہ گوئی

مختصر ترین واقعہ جس میں مزاح کی چاشنی ہو عمدہ اور لطیف پیرائے میں اس انداز سے بیان کیا جائے کہ ان الفاظ یا فقروں کو سننے والوں کو ہنسی آجائے لطیفہ کہیں گے۔ اس میں حسن بیان و حسن ادا کی پابندی ضروری ہے۔ واقعہ کی دلچسپی ندرت بیان کے ساتھ اعتدال لئے ہوئے سنانے والوں میں اور سننے والوں میں ذہنی ہم آہنگی تشبیہہ و استعارہ کے ربط کے ذریعہ ہو جو لطیفے کی جان ہیں۔ ان کی مدد سے ہمارے جذبات ہمارے تخیل سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں

لطیفے کا حسن اس کے اختصار میں ہے۔ ادھر مقرر کے منہ سے پھول جھڑنا شروع ہوں ادھر محفل میں قہقہوں کے جگنو چمکنے لگیں، اسی لیے اس کو اجمالی مزاحیہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ لمحاتی طور پر یہ ذہنی کھیل ایک ہنگامی فرار ہے۔ اس مشینی دور کی اکتا دینے والی زندگی سے جس میں فرد کی حیثیت کچھ نہیں۔ وہ خود مشین کا ایک پرزہ بن کر رہ گیا ہے لطیفے کے وقفے تک انسان سنجیدگی کے خول سے باہر آجاتا ہے اور جو وقت لطیفہ کہنے اور سننے میں کٹتا ہے وہ روزمرہ کے غم سے الگ ہو جاتا ہے۔ اتنی دیر کیلئے سب آپس کے اختلافات کو بھول کر ایک دوسرے کے ہم آواز ہو جاتے ہیں

کچھ مشینی دور ہی پر موقوف نہیں ہر دور اپنے مصائب و مسائل اپنے ساتھ لاتا ہے۔ مگر انسانی تاریخ گواہ ہے کہ جہاں اس نے ہمیشہ اپنی راہ میں کانٹے بچھائے اور بچھتے پائے ہیں وہاں اس نے کانٹوں میں پھول کھلانے کی جدوجہد بھی جاری

رکھی ہے اس حیوان ظریف کی یہی خوش طبعی ہمارے موضوع سے گہرا تعلق رکھتی ہے

لطیفے کے لئے ضروری ہے کہ مذاق سلیم پر بار نہ ہو سماعت پر گراں نہ گذرے اسی لئے لطیفے کو روح فصاحت اور نشاط روح کا درجہ دیا گیا ہے۔

لطیفہ ایک نہایت ہی لطیف شئے ہے جس کے بیان کیلئے ایک خاص قسم کی ذہانت حاضر جوابی اور بے ساختہ پن کی ضرورت ہے اگر لطیفہ بحر طویل میں چلا گیا تو وہ حکایت داستان، قصہ، افسانہ غرض کچھ بھی ہوسکتا ہے مگر لطیفے کے ذیل میں ہرگز اسکا شمار نہ ہوگا۔ پھر اس میں پانی میں اٹھنے والے بلبلے کی سی حبابی کیفیت نہ رہے گی اسے خندہ قلقل نہ کہا جاسکے گا۔ اسکے انوکھے پن کا خمار اتر جائے گا۔

لطیفہ اچھا ہو۔ لیکن سنانے والا اس کے فن سے ناواقف، جذبات تاثرات ولہجے کے اتار چڑھاؤ پر قدرت نہیں رکھتا۔ دوران بیان اصلی نکتے سے ہٹ جاتا ہے۔ تمہید کو طول دے دیتا ہے، کھانسنے اور کھنکھارنے لگتا ہے۔ درمیان میں بقیہ لطیفہ بھول جاتا ہے۔ تو پھر لطیفے کی نزاکت، تجسّس، ولطف رخصت ہوجائے گا۔ اس سے زیادہ نازک مسئلہ لطیفہ لکھنے کا ہے مخصوص واقعات، حالات اور ماحول سے متعلق لطیفہ ہوسکتا ہے۔ کہ صفحۂ قرطاس پر آکر بے روح و بے جان ہو جائے پھر اس میں وہ کشش بھی باقی نہ رہجائے جسے ہم کاغذ کے پھولوں ہی سے تشبیہ دے سکیں اور بعض لطیفے تو ایسے ہوتے ہیں جنہیں خود بیان یا ادا کیا جاسکتا ہے بہت کم لطیفے ایسے ہوتے ہیں جو کاغذ پر آنے کے بعد بھی اسی قدر تازہ اور سدا بہار رہ جائیں۔

لطیفے کی ابتدا انسانیت کے آغاز کی داستان ہے انسان جوں جوں تہذیب سے آشنا ہوتا گیا اس کا جوہر نکھرتا گیا جیسے جیسے اس کی اقامتی زندگی میں ٹھہراؤ آتا گیا وہ عام انسانی تعمیر و ترقی میں زیادہ گہری دلچسپی لیتا گیا اس کی یہی دلچسپی وہ نکتہ ہے۔ جہاں سے لطیفے کے آغاز اور فنون لطیفہ کی ابتدا ہوتی ہے اس کو

شروع میں یہ معلوم ہو گیا کہ وہ رونے کیطرح ہنسنے کے لئے بھی پابند و مجبور ہے اسکے
نفسیاتی و فطری جواز سے وہ کبھی لاشعوری طور پر بھی بے خبر و منکر نہ ہو سکا
ہنسی کے عضویاتی عمل سے قطع نظر وہ بذلہ سنجی کا ملکہ قدرت کیجانب سے لیکر آیا
تھا جس نے اسے ثابت قدمی مسلسل جد و جہد اور حرکت پر قائم رکھا اس کے
انہیں عزائم نے زندگی، زندہ دلی اور شوخیوں کے سائے میں قدرت اور اس
کے مظاہر پر فتح پائی۔ غاروں اور پیڑوں پر رہنے والے نیم وحشی انسان نے
اپنی حس کا اظہار دشمن کی کھال اتار کر اور اس کے سر قلم کر کے کیا اس میں
عصبیت تھی جھنجلاہٹ اور جہالت تھی ———— یہ وحشیانہ جذبہ
تہذیب کے عروج نے دبا تو نہیں دیا مگر کم ضرور کر دیا آج بھی غصے سے پاگل
ہو جانے اور عقل سے ہاتھ دھو لینے والے انسان کی دیوانگی اور بچوں میں یہ
یہ جذبہ مل جاتا ہے جس میں تکلیف دے کر لطف اٹھانے کی آرزو ملتی ہے
کیلے کے چھلکے سے پھسل کر گرنے والے کسی موٹے آدمی پر ہنسنے کسی نیم پاگل انسان
کو ستانے و شکار کرنیکی صورت میں اس کا اظہار آج بھی عام ہے اس عملی مذاق
کے پردے میں بنیادی طور پر وہ انسانی جذبہ پس پشت رہجاتا ہے جو کسی بیمار
بیکس و بے زبان سے ہمدردی و مدد کرنے پر اکساتا ہے وہ کمزوریاں اور خامیاں
جو آج بھی انسان کے بس میں نہیں ہیں اور جن کے لئے وہ قدرت کے آگے
بے دست و پا ہے اس کو لطیفے میں اڑا دینا ایک ایسا لطیفہ ہے جس میں کوئی جان
کوئی روح اور کوئی آمد نہیں جہاں طنز کا وار خود اپنے اوپر ہوتا ہے اور اس سے
محض ذہنی پستی و کج روی کا اظہار ہوتا ہے جس میں آورد ہی آورد ہے عملی مذاق یا
لطیفے کی انتہائی ناتراشیدہ و ناپختہ شکل نے رفتہ رفتہ ارتقائی منازل طے
کر کے اب یہ صورت اختیار کر لی ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کی ذہانت

کی اپیل پر ہنستا ہے ۔ کون متکلم ایسا ہے جو اپنے ہم جلیسوں وہم زبانوں کو خوش کرنا پسند نہ کرے گا بذلہ سنج اس قابلیت کا مالک ہوتا ہے بالعموم وہ ہر دلعزیز بھی ہوتا ہے بذلہ سنجی کے پائے کی لطافت و نزاکت نے اہل علم کو بہت جلد اس کی جانب متوجہ کر لیا۔ علم و اخلاق کے مبلغین نے اس کے پردے میں نا آشناؤں کو آشنائے راز کیا۔ جہالت ظلم اور سماجی انصاف کے طوفان پر عقل و ذکاوت کے بند باندھے اور لطیفہ بالواسطہ طور پر اصلاح و تربیت کا ذریعہ بن گیا

ہمدردی و انسانیت کی جھلکیوں کے ساتھ گہری وابستگی نے تقریر، تحریر عمل، صوت، حرکات، سکنات کے ذریعہ اس کا اظہار عام سے عام تر کر دیا۔ فنون لطیفہ کی یہ شکل رفتہ رفتہ عوام و خواص میں سب سے زیادہ مقبول و معروف ہوئی انکے لطائف نے زندہ دل بزرگوں کے برجستہ مکالموں کی شیرازہ بندی میں وہی حیثیت اختیار کر لی جو قومی اور ملکی ادب میں لوک گیتوں کی ہو سکتی ہے ۔

غیر شائستہ، خلاف قیاس واخلاق لطائف ہنوز علم سینی کی پہنائیوں میں غرق رہے ۔ خواص اور اہل علم تو درکنار عوام کے باشعور و سنجیدہ طبقے میں بھی کبھی انہیں قبول عام کی سند حاصل نہ ہو سکی انکی نفی ایک طرف تعلیم یافتہ اور مہذب طبقے نے کی تو دوسری طرف مذہبی واخلاقی حلقے بھی انکی کھلم کھلا مذمت کرتے رہے اسی وجہ سے پست و اخلاق سوز لطائف مجلس ومحفل کی کبھی زینت نہ بن سکے اور اس طرح یہ بازار کا گرا ہوا ہار کبھی گلے کی زینت و زیور نہ بن سکا گھروں میں وہی صاف ستھرے اور پاکیزہ لطائف مقبول رہے جو ذکاوت و ذہانت کا مرقع تھے اور جن کے انوکھے پن میں مسکراہٹوں کی بجلیاں اور قہقہوں کے انار تھے ۔

چونکہ لطیفہ گوئی قاری اور سامع دونوں کو فائدہ پہنچاتی ہے ۔ اور سبھی کی دل پسند چیز ہے اس لئے اس کے بارے میں ہرگز دو رائیں نہیں ہو سکتیں لہذا اچھا

مبلغ، مقرر، معلم و سیاست داں بھی وہی سمجھا گیا جو ساتھ ہی اچھا لطیفہ گو بھی ہو جو نفسِ مضمون، مطلب اور حصولِ خواہش کی خشکی اپنی بذلہ سنجی سے دور کر سکے اپنی حاضر جوابی کی سامع و قاری سے بی البدیہہ داد حاصل کر سکے۔

یہ بحث بہت پرانی ہے کہ ہم کس چیز کو خلاف تہذیب کہیں گے اور کس کو تہذیب کے دائرے میں لائیں گے۔ فحش اور غیر فحش کے الفاظ بھی نسبتی ہیں کل تک جو معیوب نہ تھا وہ سراپا آج عیب سمجھا جاتا ہے اور جو آج مستحسن ہے ہو سکتا ہے کل اس کا شمار گناہ کبیرہ میں کیا جانے لگے۔ قدریں بدلتی رہتی ہیں انہیں کے ساتھ فکر و منظر کے پیمانے بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں قدیم لکھنؤ کے شرفاء بے تکلفی سے سر بازار ضلع جگت کرتے پھبتی کستے، فقرے چست کرتے تھے مگر آج کی تہذیب اس کی روادار نہیں جب کہ یہ بات اپنی جگہ پر طے ہے کہ گذشتہ لکھنؤ کی پرانی تہذیب آج کے مقابلے میں بہت بلند تھی اس کے معیار شائستگی کی آج بھی ہم قسم کھا سکتے ہیں یورپ میں سر بازار کسی حسینہ کا بوسہ لے لینا یا اس سے بغل گیر ہونا داخل اخلاق ہے اور اس کو نظر انداز کرنا بداخلاقی، مگر آج بھی ہماری مشرقی تہذیب میں یہ انتہائی معیوب سمجھا جاتا ہے اور ایسا کرنے کی کوشش کرنے والا اخلاقی و قانونی گرفت میں آجاتا ہے۔

کسی کو خوش کرنا عقلاً و اخلاقاً ایک مستحسن فعل ہے اہل ایمان کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ "انکے چہرے ہنستے ہوئے ہوں گے" لطیفے کو "مزاح المومنین" کا درجہ عطا کیا گیا ہے اور مومن کی یہ پہچان بتائی گئی ہے کہ "مزاح کی کوشش کرتا ہے اور شیریں سخن ہوتا ہے" خود حضرت علیؓ نے اسے "حکمت کے نکتوں کا تحفہ" کہا اور اشرف المخلوقات کی پہچان" قرار دیا کیونکہ بذلہ سنجی سے عقل پر جلا ہوتی ہے۔

لطیفے کی چار قسمیں ہیں۔ (۱) تبسم آفریں (۲) خندہ دنداں نما (۳) قہقہے

۱٫ لطیفہ

تبسم آفریں کا شمار مزاح یا سنجیدہ ظرافت میں ہے یہ لطیفے کی سب سے اعلیٰ قسم ہے
اس کا تعلق دل سے نکلے ہوئے برجستہ فقرے، اچانک واقعے یا خوشگوار حادثے سے
ہوتا ہے۔ اس کی تحریک بذلہ سنجی خوش مذاقی، رمز، ابداعی، یا کسی تلمیح کے پردے میں ہوتی
ہے یہ فطری لطائف مخصوص شخصیات، واقعات، فضا اور ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں
ان میں جذبات کی تسکین مسرت حاصل کرنے اور دوسرے کی ذہانت پر ہنسنے اور ہنسانے
پر مبنی ہوتی ہے۔ غیر معمولی تاریخی شخصیتوں، بجد ذہین اور فہیم انسانوں، رہنماؤں، فلسفیوں
سیاست دانوں، معلموں، مبلغوں، صحافیوں اور دیو پیکر شخصیتوں کے حالات و واقعات
اس قسم کے دلکش لطائف سے پر ہیں یہ قطعی بے ضرر ہوتے ہیں اور ساحری کی حد تک
انسان کو مسحور کر کے اس کے بچپن کیطرف لیجاتے ہیں اس طرح عام زندگی بسر کرنے کی
قوت ہنسی کی صورت میں نکل کر بچ جاتی ہے مثلاً

"شاہ عراق جس وقت گیارہ سال کے تھے اور لندن میں
زیر تعلیم تھے ایک دفعہ ایک ماہر نفسیات نے ان سے
کہا، "جب میں بائسکل پر سوار ہوتا ہوں تو میرے
سوچنے کی رفتار دوگنی ہو جاتی ہے"، شاہ نے جواب
دیا، "پھر تو آپکو موٹر سائیکل پر بیٹھ کر سوچنا چاہیے۔"

لطیفے کی دوسری قسم خندۂ دنداں نما ہے۔ اس کا شمار مذاق کے ذیل میں آتا ہے یعنی
چھیڑ چھاڑ، چوٹ کرنے، جملہ چپکانے، فقرہ یا پھبتی کسنے، ضلع جگت یا طنز کرنے سے پیدا
ہوتا ہے۔ ان میں افادیت ہوتی ہے اور خواہش کی تسکین کے لئے کسی حربہ بکیا جاتا ہے
اس میں عدم تسکین کی بجت ہنسی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً
آسکر وائلڈ کا ایک ڈرامہ پہلی رات فیل ہو گیا

دوسرے دن اس کے دوست نے پوچھا "کہو یار تمہارا ڈرامہ کیسا رہا؟"
اسکروائلڈ نے جواب دیا "ڈرامہ بیحد کامیاب رہا لیکن دیکھنے والے فیل ہو گئے"
لطیفے کی تیسری قسم قہقہہ ہے یہ تمسخر کی فہرست میں داخل ہے اور لطیفے کی سب سے خاص قسم ہے جو ظرافت، خوش مذاقی اور طباعی کی پیداوار ہے۔ اس میں خاص چیز اس کا بے ساختہ پن اور انوکھی سادگی ہے جس سے سامع وقاری بے اختیار اور اچانک ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگتا ہے اور یہی ہنسی دراصل ہے اس بچت کی جو ہمدردی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

ایک تھیٹر کے مالک نے ایک طوطا پال رکھا تھا جو تھیٹر کے باہر پنجرے میں لٹکا رہتا تھا جب لوگ ٹکٹ لینے آتے تو طوطا کہتا "باری باری آئیے مہربان، لائن بنائیے مہربان"
اس پر لوگ لائن میں لگ جاتے ایک دن پنجرے کا دروازہ کھلا رہنے کی وجہ سے طوطا اڑ گیا طوطے کا مالک اسے ڈھونڈھتا ہوا ایک جنگل سے گذر رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ اس کا طوطا بہت سے کوؤں میں پھنسا ہوا ہے۔ اور کوّے اس کو چونچیں مار رہے ہیں اور طوطا کہہ رہا ہے "باری باری آئیے مہربان، لائن بنائیے مہربان لائن بنائیے"

لطیفے کی چوتھی قسم کثیفہ ہے دنیا کے لطائف خاص طور پر اُردو لطائف عام طور پر اس سے معمور ہیں یہ لطائف کی مکروہ شکل ہے۔ انکی تعداد بہت زیادہ ہے عموماً یہ لطائف اچھی صحبتوں، پاکیزہ محفلوں اور گھروں میں نہیں سنے یا سنائے جا سکتے۔ ان کا تعلق علم سینہ سے زیادہ ہے انکی بنیاد پھکڑ، ہجو، ضلع جگت، عریانی، فحش اور پھبتی پر ہے۔ اس کا اظہار عموماً ہر سال پہلی اپریل کو عملی مذاق کی صورت

میں بھی ہوتا ہے جس میں لطیفے کم ہوتے ہیں مگر سنائے اور گڑھے زیادہ جاتے ہیں۔ کثیف وحشیانہ جذبات وخیالات کے اظہار سے زیادہ قریب ہیں ان میں لطائف کم اور آورد زیادہ ہوتی ہے۔ مثلاً:۔

ایک دن ایک طوائف ایک محلس میں گئی اور اپنا
جوتا رومال میں لپیٹ کر اپنے پاس رکھ لیا ایک
امیر نے دریافت کیا "آپ کا جوڑا ابھی آپ
کے ساتھ رہتا ہے؟" طوائف نے جواب
دیا "جی ہاں حضور میرا جوڑا تو میرے پاس ہے
مگر آپ امیروں کا جوڑا نوکروں کے بغل میں
رہتا ہے۔"

اکثر بے وقوف شخص یا معصوم بچہ بھی لاشعوری طور پر ایسا لطیفہ سر کر دیتا ہے۔ جو ہمیشہ کے لئے ذہن و تاریخ میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اس بات کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو اس واقعہ کے تانے بانے کسی ایسے شخص غیر معمولی واقعے حال یا خیال سے لاشعوری طور پر مل جائیں گے جس نے اس معمولی ذہن کو حرکت دے کر ایسا غیر معمولی نمونہ پیش کیا ضروری نہیں کہ آپ میرے خیالات سے متفق ہوں مگر اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ زیادہ تر لطائف غیر معمولی شخصیات، واقعات وحالات سے جنم لیتے ہیں یا منسوب ہیں یوں بھی ہمارے آپ کے حلقۂ احباب میں ایسی باغ وبہار شخصیتیں خال خال نظر آتی ہیں جنکی آمد بادِ نسیم سے زیادہ لطیف اور بادِ خواب سے زیادہ نشاط آور ہوتی ہے جن کی ہر بات ایک لطیفہ ہوتی ہے۔ اور باوجود اپنی سنجیدگی، تمکنت ووقار کے محفل کو دم بھر میں زعفران زار بنا دیتے ہیں اس قسم کی شخصیتیں ہر عہد اور ہر دور

یں مل جاتی ہیں یہی وہ طاقت در د ماغ ہیں جو لطیفے کے موجد و سرچشمہ قرار دئے جا سکتے ہیں ان کے ذہنی ارتقار و اختراع کا مطالعہ دراصل لطیفے کی تاریخ کا جائزہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہی باغ و بہار مخصوص شخصیتیں اعلیٰ سطح پر جاکر فلسفی، رہنما مبلغ بھی ہو سکتی ہیں۔

دا تفاقی طور پر کسی خاص واقعے کو کی خاص تشبیہہ، استعارے یا کنایے کے ذریعہ دوسر واقعہ سے اس طرح جوڑ کر عام واقعات سے مختلف انوکھا اس کے مماثل یا برعکس ہو جائے اور اصل واقعہ کی تحریف کرے۔ لطیفے کے اقسام میں داخل ہو جاتا ہے مخصوص ماحول یا فضا سے بھی لطیفہ جنم پا سکتا ہے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ہمارا موضوع انسان ہے۔ اس کے حادثات، حالات، واقعات، ماحول سماج اور انکے آپس کے ٹکراؤ سے عدم توازن کی صورت میں جو مختصر واقعات رونما ہوتے ہیں وہ اپنے انوکھے پن کیوجہ سے لطیفہ کہلاتے ہیں۔ ہمارا تعلق جمادات نباتات سے نہیں۔ لطیفے کا کسی نہ کسی صورت میں انسان اور اس کے لوازم سے تعلق ازبسکہ ضروری و لازمی ہے۔ غیر جاندار اشیا ہمارے موضوع سے خارج ہیں کیونکہ لطیفے کا زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اس کو کسی بھی صورت میں اس سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا جو لطیفہ جتنا زیادہ مشہور اور اچھا ہوگا اتنا ہی سماج کی بڑی سے بڑی اکائی یا عالمی انسانی برادری سے متعلق ہوگا اور اس کی جڑیں سماج اور تہذیب کے باغ میں اتنی ہی زیادہ گہری ہوں گی۔

لطیفے کے بیج اسی زمین میں پھوٹتی ہیں اسی کی بیل انھیں حالات واقعات و ماحول کے سائے میں پروان چڑھتی ہے۔ وقت اور حالات موسم کی طرح بدلتے رہتے ہیں ان بدلتے ہوئے خیالات کا ٹکراؤ جدید و قدیم کی شکل میں کسی دور یا کسی بھی زمانے میں سادہ و معصوم جذبات کے سہارے شگوفے کھلاتا رہتا ہے۔

لطیفے کو اجمالی مزاحیہ بھی کہا جا سکتا ہے اسی لئے اس کے پلاٹ اور مکالمات کا اتحاد عمل اپنے ایجاز کی مدد سے مزاحیہ فضا کی تعمیر کرتا ہے تاثراتی وحدت اندرونی

تنظیم کی تکمیل اس اختصار کے ساتھ عمل میں آئے کہ اس کی منزل اتنی مختصر ہو جائے کہ ادھر تار باجا ادھر راگ بوجھا۔ جملوں کی تراش خراش اور برجستگی بھی ابلاغ کے عمل کو تیز تر کرنے میں معاون ہوتی ہے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے محاکاتی جلووں میں حسن ادا و حسن بیان کی پرچھائیاں بھی ہوں تاکہ جملوں کا رکھ رکھاؤ بہتے ہوئے الفاظ میں ہنسی کے بلبلوں کی صورت میں ظاہر ہو سکے۔ انداز بیان، طرز ادا، اسلوب و خیال کے عمومی سانچے، سماجی افراد کی ذہنی ساخت و رجحانات سے ہم آہنگ ہوں تاکہ ان لطائف کا تاثر کچھ اور شدید گہرا اور دیر پا ثابت ہو سکے۔ لطیفہ اس طرح پیش کیا جائے کہ اس کی دنیا میں جہاں حسن و دلکشی سرور و سرخوشی رقصاں نظر آئے وہاں سماج کے جن افراد کے لئے یہ پیش کیا گیا ہو وہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ بھی اٹھا سکیں۔

لطیفہ سنتے ہی بے اختیار ہنسنے لگتے ہیں اس لئے اس کا براہ راست تعلق طنز و مزاح سے ہے۔ طنز و مزاح کسی مزاحیہ کردار، مزاحیہ صورت واقعہ لفظی بازی گری، موازنہ یا تحریف کے رنگ و روپ میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اور اس کا تعلق کسی بھی لطیفے میں اس کی کسی نہ کسی شکل یا صورت سے ضرور ہوتا ہے۔ جن کا لطیفے سے بہت ہی نازک تعلق و لطیف فرق ہے اس لئے اس کو ان سے جدا نہیں کیا جا سکتا یہی وہ کیفیتیں ہیں جن میں لطیفہ بالعموم جنم پاتا ہے مثلاً

طنز و مزاح، ظرافت، رمز، لغز، طباعی، بذلہ سنجی
حاضر جوابی، مذاق، عملی مذاق، خوش مذاقی، اداکاری
تحریف، تشبیہہ، استعارہ، کنایہ، تکرار، رعایت لفظی
ضلع جگت، مضحک، ہجو، پھکڑ، عریانی، ہزل
زٹل، فحش، پھبتی، آوازہ، طعنہ، فقرہ، فقرہ بازی

جملہ بازی، چوٹ، جلی کٹی

لطیفہ گو عموماً ظریف ہوتے تھے جو خوبصورت، خوش سیرت خوش قیافہ خوش بیان، ذہین، دانا، معتدل ہوتے تھے وہ جربہ اتارنے کے فن سے بھی واقف ہوتے تھے۔ وہ لطائف کے پردے میں تاریخی معلومات اور نصیحتوں کے ساتھ گذری ہوئی زندگی کے اعلیٰ نمونوں سے بھی روشناس کرواتے چلتے۔ مثال کے طور پر درویشوں اور داناؤں کی عقلمندی، خود داری، فیاضی، حق پرستی عبرت اور عدل کی مثالیں پیش کرتے اور حکایتیں سناتے کیونکہ ان کا سب سے اہم فریضہ پتھر کو موم کرنا ہوتا تھا۔ اور عرض کرنے سے پیشتر جان کی اماں پانے کے باوجود جان سخت خطرہ میں رہتی تھی مطلق العنان حکمرانوں کے ندیم و وزیر کی حیثیت سے ان کے اندر روشن خیالی اور توازن پیدا کرنا انھیں عدل کی سیدھی لکیر سے نہ بھٹکنے دینا اور لطیفے کی لاٹھی کے ذریعہ رعایا کے ان گلہ بانوں کو غیر شعوری طور پر ہانک کر دوبارہ راہ عدل پر لگادینا ہوتا تھا۔ خارجی و بیرونی مضر اثرات، عدم توازن، بے ڈھنگے پن اور عدم تکمیل پر طنز کر کے وہ اس خدمت کو انجام دیتے تھے ان کا مقصد اس کے پردے میں عمل جراحی کر کے فساد و فشار دور کرنا بھی ہوتا تھا سولی پر چڑھتے وقت بھی لطیفہ سنانا اسی جرأت و عظمت کی داستان ہے۔

ظریف حاضر جوابیوں کا آئینہ تھے۔ ان کے درمیان جو نازک کلامیاں ہوتیں وہ شاہان وقت کو اتنی دیر کیلئے جنگی مہمات، پیچیدہ مسائل، سیاست اور تفکرات کے عالم سے اٹھا کر ایک ایسی دنیا میں پہونچا دیتیں جہاں بذلہ سنجی کے سرچشمہ سے مسرت و ذہانت کے سوتے پھوٹتے علم و حکمت کے یہ مہذب جلسے بلا کسی منطقی امداد کے سامعین کو خود بخود اس ذہنی سطح پر لے جاتے جہاں سچی ظرافت اپنے جوہر دکھاتی ہے اور ایسی ہر صحبت یادگار ہو جاتی ہے۔

ہر دربار اور ریاست سے وابستہ لطیفہ گو یا ظریف ہوا کرتے تھے جن کا کام تھکے ہارے حکمراں کو اپنے باغ و بہار لطائف کے ذریعہ تازہ کر دینا ہوتا تھا ان درباروں میں جب تعیش کی لہر آئی انھوں نے میدان جنگ کے مقابلے میں حرم سرا اور جلوت کے مقابلے میں خلوت کو ترجیح دی تو نہ صرف لطیفہ گوئی کا پیشہ عام ہوا بلکہ ظرفا، کی کثرت نے اس پیشہ کو اس کی سطح سے بہت پست کر دیا عام اور سستے مذاق، پھکڑ، ٹھٹھول اور ابتذال کی کھلی چھوٹ نے ظریف کو مسخرہ، بھانڈ اور لطیفے کو کثیف بنا دیا ورنہ لطیفہ گو نہایت کڑھا کڑھایا، ترشا ترشایا ماہر فن ہوا کرتا تھا جس کی ذکاوت، ذہانت، علمیت اور سوجھ بوجھ حاضر جوابی، بذلہ سنجی اسے دوسروں سے داد دلواتی تھی۔ بالواسطہ طور پر وہ اتالیق، نگراں یا مشیر کار کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ جیسے بیربل اور ملا دو پیازہ جو محض ظریف نہ تھے بلکہ دربار اکبری کے نورتن اور وزیر با تدبیر بھی تھے وہ ملکی معاملات پر ایک ماہر سیاست کی حیثیت سے بھی نظر رکھتے تھے۔

لطیفہ گویوں نے بہت سے مجرموں کی خطائیں و سزائیں معاف کرائیں سلاطین وقت کی کایا پلٹ کی بے قصوروں کو محفوظ کیا مغلوب سرخرو ہوئے جلاوطن حب وطن کے دامن سے ہمکنار ہوئے۔ بدکرداروں کو نیک بنایا معزول بادشاہوں کو ان کے ملک واپس دلوائے خستہ حالوں کو دم بھر میں آسودہ کیا۔ ان گنت جھگڑے فیصل کروائے شاہان وقت سے بیش بہا صلے پائے۔

تحریر کا فن ایجاد ہونے سے قبل لطائف سینہ بہ سینہ نسل در نسل چلتے رہے انکی حد بس زبان تک رہی۔ تحریر کا فن ایجاد ہونے کے بعد بھی عرصے تک لطائف پر توجہ نہیں کی گئی پھر سلاطین و مشاہیر کے حالات و تصانیف میں انکی جھلک ملنے لگی۔ قدیم ترین کتاب ”حکیم ایسپ کی کہانیاں“ ہے جو اس لئے بچوں کے درس

اخلاق کے لیئے جانوروں کی زبان سے بیان کی ہیں۔ عربی میں سب سے پہلے علامہ
جاحظ ۱۵۰ھ تا ۲۵۵ھ اس کی تصنیف "خود اپنی بات" کے لطائف قابل ذکر ہیں
جس کی تقلید میں دوسرے قابل ذکر کارنامے وجود میں آئے۔ عربی سے یہ ذوق
فارسی میں آیا۔ نظامی سمرقندی نے ۵۴۰ھ میں "مجمع الانوار" لکھ کر فارسی ادب میں
لطائف قلمبند کرنے کی داغ بیل ڈالی مگر سب سے زیادہ مقبولیت "مجمع الحکایت"
کو ہوئی اور فارسی میں یہ رواج اتنا جڑ پکڑ گیا کہ ہر تذکرہ و بیاض نگار شعر و ادب
کے ساتھ لطائف بھی نقل کرنے لگا۔ "نفائس الحکایات"، "مضحکات" اور "مطائبات
سعدی" وغیرہ اس سلسلے کی بے حد اہم کڑیاں ہیں۔ اردو کو یہ مذاق فارسی سے ورثہ
میں ملا۔ شروع میں لطائف نظم ہوتے رہے۔ میر نے فارسی میں لطائف پر ایک
مختصر رسالہ لکھا۔ انشاء نے لطافت کے دریا بہائے مگر ادبی لطائف کی باقاعدہ
ابتدا مرزا غالب سے ہوئی۔ مولانا حالی نے یادگار غالب میں انکے لطائف کو ایک
باب کی صورت دی۔ اور مرزا کو حیوان ظریف کہا اس وقت سے اردو میں مشاہیر
کی سوانح عمریوں میں بھی لطائف کو جگہ دی جانے لگی۔ اسی زمانے میں "پیام یار لکھنؤ"
اور "پیام عاشق" "قنوج" نامی گلدستے شائع ہوتے تھے جو اپنے لطائف کیلئے
مشہور ہیں۔ یہی اہتمام بعد میں "فتنہ" "اودھ پنچ" "اپنچ" اور "اودھ اخبار" میں بھی ملتا ہے

دنیا کی ہر زبان میں لطیفوں کی دنیا کی آباد ہے جس میں اسکے اپنے لطیفے کم اور
دوسری زبانوں کے زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن ہر زبان میں اکثر ایسے الفاظ ملتے ہیں جن کا
مترادف دوسری زبانوں میں نہیں ہو سکتا۔ لطیفہ دراصل عربی کا لفظ ہے جس سے یہ
فارسی اور اردو میں آیا۔ انگریزی زبان میں لطیفے کیلئے ہم کو کوئی ایک مخصوص لفظ
نہیں ملتا بلکہ Jest, IRONY, PLEASENTRY, WIT, MOT.
QUIP, PUN, HUMOUR, JOKE اور SATIRE وغیرہ ملتے ہیں

دراصل ان سب کا لطیفہ سے بہت ہی قریب کا تعلق ہے مگر پھر بھی ان سے لطیفے کا مفہوم صحیح طور پر نہیں ادا کیا جاسکتا۔ مغربی لطائف کو ہم اسی عنوان کے تحت تسلیم کرتے ہیں جس سرخی کے ساتھ وہ ہم تک پہونچے ہیں۔

لطیفے کی ابتدائی شکل حکایتوں کی صورت میں ملتی ہے جس میں لطیفے کے پردے میں فیلسوف، بزرگ، درویش، صوفیا، کرام اور وزیر دانا شاہان وقت اور مریدوں کو ان حکمت اور نصیحت آمیز حکایتوں کے ذریعے راہ حق پر لگانے کی سعی کرتے۔ اس کی مثال حکیم ایسپ یا لقمان، بقراط، ارسطو، افلاطون، دیو جانس کلبی بزرگ جمہر، وید بھان برہمن، جعفر برمکی، شیخ سعدی، شکسپیر، ڈاکٹر جانسن ابو الفضل، بیربل، ملّا دو پیازہ اور نعمت خاں عالی محض ظریف اور لطیفہ گو ہی تھے بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ ان مفکّروں مبلغوں اور وزیروں کے حکیمانہ نکتوں نے لطیفے کو دربار سے نکال کر مکتب و خانقاہ تک برابر تراشا، سنوارا، نکھارا، انھیں کی بنیاد پر اخلاق و تہذیب نے گلستاں، بوستاں اور انوار سہیلی جیسے فلک بوس قصر تعمیر کیے۔

آج دربار کیساتھ یہ فن بھی رخصت ہوا اب کوئی سعادت علیخاں نہیں جو انشاؔ کے لطیفے سنے کوئی بہادر شاہ ظفر نہیں جو مرزا کو ان کے حسن طلب کی داد دے وہ باغ و بہار شخصیتیں اب اس قدر عام نہیں کیونکہ اب انکے قدر داں نہیں یہ سب فراغت کی باتیں تھیں جو بادشاہت، جاگیرداری، زمینداری کے ساتھ رخصت ہوئیں۔ ارباب نشاط کے ساتھ لطیفہ گو اور لطیفہ گوئی دونوں رخصت ہوئے۔ رنگیلے پیا اور انکے جانشینوں کی سرپرستی زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی۔ محمود و اکبر جیسے سرپرستوں کیتھا ساتھ فردوسی، سعدی، ابو الفضل اور بیربل جیسے ظریفوں کا دور بھی ختم ہوا وزیر اور ندیم کی جگہ مسخرے بھانڈ اور مفت خورے زیادہ دن نہ رہ سکے انھوں نے آتے ہی اس قدر دھول

اڑائی کہ لطیفے کا دامن گرد و غبار سے اٹ گیا۔ اس کی آب اتر گئی، "آپ سے"، "تم"، اور "تم سے"، "تو"۔ تو تو میں میں اور اس کے بعد عضویاتی مظاہرے ہونے لگے۔ "شیخ چلی" کی جگہ "شیخ سدو" آئے۔ بگرا مساک کھا کے انھوں نے منہ کا مزہ خراب کرا کے ہی دم لیا۔ لطیفہ دربار سے نکل کر بازار میں آیا۔ ضلع جگت اور پھبتیاں اس پر حاوی ہو گئیں۔ ان نوازشات کا یہ اثر ہوا کہ لطیفہ گوئی کا بلند معیار گرنے لگا۔ علماء کی جگہ جہلا نے سنبھال لی۔ اجنبی ہاتھ اسے سنبھال نہ سکے۔ ردِ عمل کے طور پر خواص و عوام کی ذہنی سطح پست ہونے لگی۔ اس کی روشنی میں اگر ہم دہلی اور لکھنؤ کی حکومتوں کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ معاشی اور سیاسی زوال نے اس تہذیبی زوال کو اور بھی تیز تر کر دیا۔ دوسری دیسی ریاستیں بھی اس تاریخ کے بہاؤ سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکیں۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب، غیر ملکی عملداری اور دیسی حکومتوں کے خاتمے نے اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ لطیفہ گوئی کی روشنی میں دیکھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کس عہد کا کیا مذاق تھا۔

بادشاہت کے ساتھ ساتھ لطیفہ گوئی کا بھی عہد رخصت ہوا۔ لطیفہ بازار سے دربار میں واپس نہ جا سکا۔ اب تک عام انسان تاج و تخت سے علاحدہ کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا تھا لیکن اندرونی آزادی اور جمہوریت اپنے ساتھ آزادی کا پیغام لائی۔ ملوکیت رخصت ہوئی۔ فرد کی اہمیت سماج میں بڑھ گئی۔ انفرادی حیثیت سے پھلنے پھولنے کے مساوی حقوق نے شخصی آزادی کو سرسبز ہونے کا موقع دیا۔ شخصی آزادی کے ساتھ ادب و صحافت نے پھر سنبھالا لیا۔ جس کے دامن میں ظرافت نے پناہ لی۔ بہت جلد وطنِ عزیز پھر "اودھ پنچ" کے قہقہوں سے گونجنے لگا۔ اودھ پنچ لطائف کا سرچشمہ ہے۔ اب ظریف اور داستان گو کی جگہ کتب و رسائل نے سنبھال لی۔ ملا نصر الدین کو اردو والوں نے شیخ چلی کے روپ میں پیش کیا۔ عربی والوں کے پاس جاحظ اور فارسی والوں کے پاس ملا کا کردار تھا مگر اردو ادب

کے میدان میں کوئی نمایاں کردار نہ پیش کر سکا۔ شیخ چلی، ملاجی، حافظ جی، پنڈت جی لال بجھکڑ شیخ جی، خان صاحب، نواب صاحب، افیمچی، میاں جی کے پردے میں لطائف سماج کی خامیوں پر طنز کرتے رہے۔ کچھ شخصیتیں بھی سامنے آئیں اور کچھ لطائف کتابی صورت میں سامنے آئے۔ عہد جدید کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ لطائف کتب و رسائل کی صورت میں محفوظ ہونے لگے۔

اردو ادب میں کلاسکی لطائف کا ذخیرہ بہت کم ہے۔ بلکہ یوں سمجھیے کہ خس و خاشاک کا ایک پہاڑ ہے جس میں کہیں کہیں طنز و مزاح کی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں ورنہ زیادہ تر ان کتائف کی آورد ثقالت و عریانیت مذاق سلیم پر بار گذرتی ہے ان میں ،، گلدستۂ پنج ،، فتنہ ،، خندۂ گل، مذاق کا پٹارا، ہنسی کا گول گپا، دیوار قہقہہ، لاحول شیطان بیربل، لاد و پیازہ، شیخ چلی، لطائف و ظرائف، رنگ ظرافت، غالب کے لطیفے آب حیات کے لطیفے، نوادر ٹھیکیاں، اور گدگدیاں ادیبوں کے لطائف، لطائف الشعرا اکبر کے لطیفے، سیاہ حاشیے، ملا نصر الدین کے لطیفے اور مجاز کے لطیفے اردو ادب کا ایک گلدستہ ہیں جس میں گل بھی ہیں گل بھی ہیں۔ بیشتر لطائف اچھے مذاق و معیار پر پورے نہیں اترتے۔ ان مجموعوں کے ساتھ ایک لطیفہ یہ بھی ہے کہ عموماً بیشتر کتب میں تقریباً ایک ہی سے لطیفے معمولی ردّ و بدل کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کا چہرہ ماند و مسخ کر دیا ہے۔ دفتر کے دفتر الٹنے پر بھی بسا اوقات ایک لطیفہ بھی ایسا نہیں ملتا جو علمی و ادبی معیار پر پورا اتر سکے۔ بعض کتب میں خال خال ایسے لطائف مل جاتے ہیں جو روح کو پھڑکا دیتے ہیں۔ ذہانت کو حرکت دیتے اور ہمارے لئے مسرت کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

دور حاضر اردو لطائف کی تاریخ میں اس وجہ سے اہم ہے کہ اس میں سے اپنا کھویا ہوا درجہ اور وقار رفتہ رفتہ واپس مل رہا ہے۔ اچھے ادبی انتخاب سامنے

اُر ہے ہیں۔ ادبی رسائل، منتخب رسائل اور بچوں کے رسائل خاص طور پر اچھے اور معیاری لطائف کو زیادہ سے زیادہ اپنے دامن میں جگہ دے رہے ہیں

لطیفہ گوئی کی موجودہ صورت حال سے اس خیال کو تقویت ہوتی ہے کہ اس کا مستقبل خاصا واضح اور روشن ہے اس میں اصلاح اضافہ اور ترقی کے امکانات بہت صاف ہیں۔ اردو زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی ترقی بھی فطری و لازمی ہے۔ زبان کے پھیلاؤ، گہرائی اور گیرائی کے ساتھ اس میں جو اضافے ہوئے ہیں ان کا معیار آئندہ اور بھی ستھرا اور بلند ہوگا

مُلاّ نصر الدّین

شہرۂ آفاق ظریف ،، مُلاّ نصر الدین ،، کی یاد میں حال ہی میں ترکی ، روس اور ایران میں مختلف تقریبات منعقد کی گئیں ۔

اس موقع پر مختلف اخبارات و رسائل نے ،، ملا نصر الدین نمبر ،، نکالے ملا کی دلچسپ زندگی اور لافانی مزاح پر کتابیں شائع کی گئیں بہت سے جلسے اور سیمینار ہوئے ترکی کے شہر قونیہ میں ،، یوم ملا نصر الدین ،، بڑے زور شور سے منایا گیا اور انقرہ تھیٹر نے ملا کی زندگی پر ایک مزاحیہ ڈرامہ اسٹیج کیا ۔

ہندوستانی اخبارات و رسائل نے ،، مُلاّ نصر الدین ،، کے لطائف شائع کئے ۔

ماسکو اور تہران کے تھیٹروں نے ،، ملا نصر الدین کے لطیفے ،، اسٹیج کئے اس موقع پر مُلاّ نصر الدین پر ایک کتاب چھاپی جس میں یہ دلچسپ دعویٰ کیا گیا کہ ،، مُلاّ نصر الدین ترکی نہیں بلکہ چین میں پیدا ہوئے تھے اور ملا کا ترکی یا ہندوستان سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔

ملا نصر الدین کے بارے میں عجیب و غریب روایتیں ہیں مثلاً یہ کہ سیر و سفر کے رسیا اس ازلی سیاح نے اپنے سست رفتار گدھے پر دنیا کا سفر کیا تھا مُلاّ نے ٹٹو پر دنیا کا سفر کیا یا نہیں مگر اپنے لطائف کے دوش پر یہ سفر ضرور پورا کر لیا مُلاّ کا گدھا کسی بھی صورت میں ڈان کوئیکزاٹ اور رخوجی کے ٹٹو سے کم نہیں ۔ ملا کا سفر ابد تک جاری رہے گا دنیا کی تقریباً ہر زبان میں مُلاّ کے واقعات فیصلے لطیفے حکایتیں مضحک واقعات اور سفر نامے ترجمہ ہو کر مقبول ہو چکے ہیں

مُلّا کے باغ و بہار لطائف میں آفاقیت ہے اس لیئے یہ ہر ملک اور قوم کے مذاق، مزاج، رسوم اور سماجی عوامل میں اس طرح گھل مل گیئے ہیں کہ ملّا ازلی سیاح ہونے کے ساتھ ساتھ عالمی شہری بھی بن چکے ہیں۔ مُلّا کے لطائف کی روایت ہر ملک میں کچھ نہ کچھ مختلف ضرور ہو گئی ہے مگر یہ اختلاف جزئیات کا ہے۔

مُلّا کا کردار کہیں ان لطائف میں غائب نہیں ہو پاتا ان کا نام زماں و مکاں کے ساتھ برابر روپ بدلتا رہا۔ اس کے باوجود ملّا کا نام چھپائے نہیں چھپتا۔ ملّا نصر الدین، مُلّا ہدہد، ملّا جعا، ملّا دو پیازہ، شیخ چلّی، بیربل، لال بجھکڑ، قاضی جی، منشی جی، اور نواب صاحب کی شہرت کے سر بفلک ایوان ملّا نصر الدین کی قہقہہ زار بنیادوں پر استوار ہیں۔

مُلّا نصر الدین اپنی حاضر جوابی، خوش باشی، زندہ دلی کی وجہ سے آج بھی زندہ ہیں۔

مُلّا کا مزاج لافانی ہے اور اس وقت تک کبھی پرانا نہ ہوگا جب تک کہ ایسے لوگ باقی ہیں جو ایک ستھرے اور شستہ مذاق کو پسند کرتے ہیں۔ ملّا کے لطائف کی خصوصیات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو بآسانی یہ بات واضح ہو جائیگی کہ جن لطائف میں کسی قسم کی کثافت یا ثقالت ہے وہ ملّا نصر الدین کے نہیں ہیں بلکہ ان سے منسوب کر دیے گیئے ہیں اور ان کی حیثیت محض الحاقی ہے۔

مُلّا کے ان پرلطف واقعات اور باتوں پر آج بھی لوگ اسی طرح ہنستے ہیں جیسے مُلّا کے زمانے میں ان پر لوگ ہنسا کرتے تھے۔

مُلّا سے متعلق روایات کے مطابق انھوں نے مختلف ملکوں کا سفر کیا تھا۔ اور مختلف درباروں سے وابستہ رہے تھے اکثر تذکروں میں ملّا کے ترکی، ایران، عرب، ہندوستان، روس، چین جانے کے بارے میں روایتیں ہیں۔ مگر ان روایتو

کی حیثیت قیاس آرائی سے زیادہ نہیں۔ ملّا کس کس زمانے میں اور کس بادشاہ کے عہد میں کس ملک میں رہے اس کے بارے میں تاریخ خاموش ہے مگر اسکے باوجود ملّا کی دیومالائی اور افسانوی حیثیت مسلّم ہے

ملّا ہندوستان کب آئے؟ آئے بھی یا نہیں؟ اس کے بارے میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ مگر ملّا کا ایک بھی لطیفہ ایسا نہیں جو ہندوستانی یا اردو ادب میں نہ موجود ہو۔ بیربل، ملّا دو پیازہ، شیخ چلی، لال بجھکڑ، قاضی، شاطر، عیار منشی اور نوابوں سے متعلق لطائف میں ملّا نصرالدین کی روح کارفرما نظر آتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اور اردو کی نوک کہانیاں، حکایتیں، قصے، عوامی کہانیاں اور لطیفے ہمالہ کی بلندیوں کو پار کر کے صدیوں قبل ترکی، ایران، عرب، چین اور روس میں پہونچ چکے تھے۔

ملّا نصرالدین کا کردار زندگی اور زندہ دلی کا ایک لازوال مرقع ہے ان کا کردار زندگی سے بھرپور ہے۔ ملّا کا باقاعدہ گھر بار ہے جو بار بار بستا اور اجڑتا ہے اس میں ویرانی کے بجائے ایک چہل پہل اور رفاقت مستی ہے۔ ملّا کے بیوی بچوں سے لیکر گدھے تک سب اسی رنگ میں سرشار نظر آتے ہیں ملّا کی گھریلو زندگی، بیوی بچوں سے ہنسی مذاق گھر کے باہر ملّا اور ان کے پڑوسیوں کی بوقلمونیاں عجب بہار کا سماں پیش کرتی ہیں

ملّا ہرفن مولا ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا پیشہ ہو جسے ملّا نے اختیار نہ کیا ہو کبھی وہ معلّم کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں کبھی منبر پر وعظ دیتے نظر آتے ہیں کبھی ایک تاجر کی حیثیت سے مصروف نظر آتے ہیں کبھی معمار کی شکل میں مکان بناتے ملتے ہیں۔ کبھی درزی کی حیثیت سے کپڑے سیتے دکھائی دیتے ہیں کبھی قاضی کی حیثیت سے دونوں فریقوں کے حق میں فیصلہ کرتے ہوتے ہیں اور کبھی ایک سیاح کیطرح جہاں گردی میں افتاں و خیزاں ٹٹو پر سوار نظر آتے ہیں۔ ان کی زندگی ایک مسلسل سفر ہے وہ ابد کے مسافر ہیں۔

مُلاّ زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہے۔ سنجیدہ سے سنجیدہ محفل، زندگی سے مایوس مریض، قبرستان کی غم انگیز فضا اور درباری جاہ جلال کی پرہیبت خاموشی میں مُلاّ کے زعفران زار قہقہے ہر طرف لطیفوں کی پھلجڑیاں اور انار چھڑاتے نظر آتے ہیں۔ مُلاّ ہر طرف مٹھیاں بھر بھر کے شادمانی کے جوہر لٹاتے نظر آتے ہیں

مُلاّ نصرالدین کوئی خیالی کردار نہیں۔ البتہ بے شمار من گھڑت واقعات اس کی ذات سے منسوب کر دیئے گئے ہیں۔ مُلاّ کی زندگی میں ایسے واقعات بہت ہوئے جو اپنے انوکھے پن اور ذہانت کی وجہ سے ہمیشہ دلچسپی کے باعث رہیں گے یہی واقعات مُلاّ کی ہر دلعزیزی اور لازوال شہرت کا باعث ہیں ہر محفل کو گرم کرنے کیلئے آج بھی مُلاّ کی یاد تازہ کی جاتی ہے۔

نصرالدین اپنے عہد کا انتہائی خوش مزاج اور ظریف الطبع مُلاّ تھا مُلاّ تنگ نظر اور زاہد خشک نہ تھا وہ ہر وقت ہنستا اور مسکراتا رہتا تھا مُلاّ ہنسی ہنسی میں اہم اور ٹیڑھی باتیں اور باریک نکتے بالکل سیدھے سادے طور پر سمجھا دیتا تھا۔ اس کا مزاح اور طنز آمیز باتیں دل پر فوراً اثر کرتیں سننے والے ہنستے ہنستے زندگی کی کسی بڑی حقیقت پر غور کرنے لگتے

مُلاّ نے سنجیدہ فکر کو بیدار کرنے کے لئے کبھی پند و نصائح سے کام نہیں لیا حالانکہ مُلاّ نے زندگی بھر صرف نصیحتیں ہی کیں مگر براہ راست نہیں مُلاّ کا نظریہ یہ تھا کہ اس روتی منہ بسورتی دنیا میں لوگوں کو سمجھانے کے لئے ضروری ہے کہ ان کی سمجھ کے مطابق بات کی جائے۔ اور بات سمجھانے کے لئے ہنسی مذاق کو اپنا شعار بنایا جائے مُلاّ نصرالدین نے اپنے اس نظریہ کو اس حد تک عملی جامہ پہنایا کہ وہ خود جان بوجھ کر ظرافت کے اس عمل سے گذرتے رہے جس میں تماشے اور تماشائی میں فرق نہیں رہ جاتا اور ہنسانے والے کی اعلیٰ

ظرفی اپنے اوپر قہقہے لگانے اور لگوانے پر بھی قادر ہو جاتی ہے اس طور پر مُلّا نے عقلمندی کیساتھ لوگوں کو اچھی باتیں ذہن نشین کرا کے لطیفے کے افادی مرتبے کو بہت بلند منزل عطا کر دی۔

صدیوں سے ہندوستان، عرب، ایران، ترکی، روس، چین میں مُلّا نصیرالدین کے لطائف سینہ بہ سینہ چلے آ رہے ہیں۔ عربی، فارسی، ترکی، اردو، انگریزی فرانسیسی، روسی، چینی، جاپانی، اور دنیا کی متعدد زبانوں میں مُلّا کے لطائف بار بار کتابی شکل میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

مُلّا نصرالدین کو ترکی میں مُلّا نصرالدین ہدی۔ ایران میں مُلّا نصرالدین، روس میں مُلّا نصیرالدین، ہندوستان میں مُلّا دو پیازہ، چین میں مُلّا نصیرالدین اونتی اور عرب میں مُلّا جحا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مُلّا نصرالدین کے سب سے زیادہ روپ ہندوستانی ظریفوں کے پیکر میں جلوہ فگن نظر آتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ مُلّا دو پیازہ، شیخ چلّی، بیربل، لال بجھکڑ قاضی جی، منشی جی، حکیم جی اور نواب صاحب کے علاوہ حاجی بغلول، خوجی، ابن الوقت، چچا چھکن، میاں بوت اور اردو کے دوسرے مزاحیہ کرداروں میں بھی مُلّا نصرالدین کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

مُلّا نصرالدین کا مُلّا دو پیازہ سے موازنہ بڑی حد تک ممکن ہے لیکن مُلّا نصرالدین کے خال خال اثرات شیخ چلّی اور لال بجھکڑ میں بھی مل جاتے ہیں۔ مُلّا کے الحاقی لطائف ان سب مزاحیہ کرداروں میں اس فرق کے ساتھ نظر آ جاتے ہیں کہ یہ کردار تقریباً حماقت کے پتلے ہیں اور بہت کم ان میں ذہانت کی جھلک نظر آتی ہے جب کہ مُلّا ذہانت کا پتلا ہے اور کہیں کہیں اس میں حماقت کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔ مُلّا کی باتیں عقلمندی اور ظرافت کا ایک خوشگوار امتزاج پیش کرتی ہیں اس

ظرافت میں بلند فلسفیانہ نکات پنہاں ہیں

ملّا کے لطائف میں ہندوستان بر کی ، عرب ، اور ایران کی جھلک بہت گہری ہے ۔

ملّا کا کمال یہ ہے کہ وہ اس دنیا کے چلتے پھرتے انسان ہیں

عرب میں ملّا نصرالدین کے دونوں روپ ملتے ہیں یعنی خالص ملّا نصرالدین اور بڑی حد تک ملّا جحا ۔ ملّا نصرالدین کے کردار میں مقامی اثرات کے تحت یہاں تبدیلیاں ہوئی ہیں ۔ مثلاً یہ لطیفے ملاحظہ فرمائیے ان پر مقامی چھاپ بھی ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ دونوں کے نام سے یہ لطیفے عربی میں مل جاتے ہیں ۔

عمامہ گرنے کی آواز

ملّا کی بیوی زمین پر کوئی بھاری بھرکم چیز گرنے کی آواز سن کر گھبرائی ہوئی ملّا کے پاس آئی اور پوچھا ۔

"کیا گرا ؟

"گھبرانے کی بات نہیں ، میرا عمامہ کرسی سے فرش پر گر گیا تھا "

"صرف عمامہ گرنے میں اتنی آواز تو نہیں ہوتی " ؟

"تم سچ کہتی ہو نیک بخت ! اتفاق سے میں بھی عمامہ کے اندر تھا

پردار اونٹ

فجر کی نماز پڑھانے کے بعد ملّا نے بلا کسی وجہ کے بتائے نمازیوں سے کہا "

"خدا کا شکر ادا کرو " کسی نے پوچھا ۔

"کیوں ۔؟ ملاّ نے فوراً بات بتائی'

"اس کے لئے کہ خداوند کریم نے اونٹ کو بے پر کا بنایا، اگر اس کے پر ہوتے تو مکانوں کی چھتوں پر اڑ کر آ بیٹھتا اور چھتوں میں شگاف پڑ جاتے ۔۔۔

خدا کا شکر

ایک رات ملاّ کو نیند نہیں آ رہی تھی ۔ انھوں نے چاندنی میں چمکتی ہوئی ریت کی طرف دیکھا تو نظر آیا کہ درختوں کے درمیان سے کوئی ملاّ کو جھانک کر دیکھ رہا ہے ملاّ نے چور سمجھ کر فوراً تیر چلا دیا، چور گر پڑا ۔

ملاّ اس کی طرف دوڑے مگر قریب جانے پر معلوم ہوا کہ ان کی بیوی نے دو بانسوں میں پھنسا کر سوکھنے کے لئے ان کی قبا پھیلائی تھی جو بار بار ہوا سے ہلتی تھی ۔

ملاّ نے گھبرا کر کہا ۔۔

"خدا کا شکر ہے کہ میں قبا پہنے ہوئے نہیں تھا ۔

عرب میں ملاّ نصر الدین کے جو لطیفے مشہور ہیں ان میں سے بیشتر لطائف ہمارے کلاسیکی ذخیرے میں پہلے سے محفوظ ہیں ۔

روس میں ملاّ نصر الدین کے لطیفے "ملاّ نصیر الدین" کے نام سے منسوب ہیں ۔ ان میں سے بیشتر لطائف کے گہرے اثرات ہیں ۔ روس نے بھی ملاّ کو اپنا لیا ہے ۔ ملاّ نصیر الدین کے یہ لطیفے بھی پڑھئے

کوٹ کی تواضع

ملاّ نصیر الدین ایک دعوت میں بالکل معمولی لباس میں چلے گئے انھوں نے

جاتے ہی بھانپ لیا کہ خوش پوشاک مہمانوں کے مقابلے میں انکی سادہ لباسی پر نہ صرف معزز مہمان مضحکہ خیز نگاہیں ڈال رہے ہیں بلکہ ملازم بھی سرگوشی کر رہے ہیں

ملا فوراً اپنے گھر کی طرف دوڑے اور فر کا قیمتی کوٹ پہن کر دعوت کے ہال میں دوبارہ داخل ہوئے۔ اس مرتبہ سب نے ان کا بڑی گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا اور بڑے احترام کے ساتھ سب سے ممتاز نشست پر جگہ دی ملازم بھی ملا کے آگے پیچھے دوڑنے لگے

ملا نے چمچے میں شوربا بھر کر قطرہ قطرہ شوربا فر کے کوٹ پر ٹپکانا شروع کیا اور اونچی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"کھا میرے کوٹ کھا ۔ ۔ ۔ میں نہیں بلکہ تو ہی ہے جو یہاں مدعو کیا گیا ہے

بلّی کیا ہوئی؟

ملا نصیر الدین نے بیوی کو تین سیر گوشت بھیجا جس کے ساتھ ایک خط میں یہ بھی لکھا کہ "دن میں سخت مصروفیت کے سبب نہ آسکوں گا مگر رات کو تمہارے ساتھ گوشت کھانے میں شریک ہوؤں گا

خط میں ملا نے اس کے پسندیدہ روسی سالن بنانے کی ترکیب بھی لکھ دی تھی۔ بیوی نے گوشت دن ہی میں تیار کر لیا وہ کھانا کھا رہی تھی کہ اسکی سہیلیاں بھی آگئیں اور وہ بھی کھانے میں شریک ہوگئیں سب گوشت ختم ہوگیا۔ رات کو ملا نے گھر آکر کھانے کے لئے گوشت مانگا تو ملا کی بیوی نے ڈر کے مارے بہانہ کر دیا کہ

"تم نے جو تین سیر گوشت بھیجا تھا وہ بلی کھا گئی"

ملا نے فوراً بلی کو پکڑ کر ترازو میں تولا تو پوری تین سیر کی نکلی ملا نے بیوی سے کہا "اگر یہ تین سیر کی ہے تو تین سیر گوشت کہاں ہے؟ اور اگر میرے ہاتھ میں تین سیر گوشت

ہے تو آخر بلی کہاں ہے۔؟..

گھوڑے کی دم

ایک کسان نے ملا سے پوچھا

.. گھوڑے کی دم کس قدر کاٹی جائے ؟ .. ملا نے کہا

.. گھوڑے کی دم خواہ تم کم کاٹو یا زیادہ پھر بھی کچھ لوگ اسے بڑی کہیں گے اور کچھ لوگ چھوٹی۔

چینی .. ملا نصیر الدین .. کی پیدائش پانچ سو برس قبل تیرہویں صدی عیسوی میں بتاتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ .. ملا نصیر الدین ادنتی چین میں پیدا ہوا وہ تیمور لنگ کا وزیر اور مصاحب تھا۔ ملا کے علم وفضل، فراست اور بذلہ سنجی سے بہت متأثر تھا۔ اس نے ملا کو قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) بنانے کی بھی پیش کش کی مگر ملا نے قبول نہ کی کیونکہ وہ عوامی شخصیت کا مالک تھا اور عوام میں حاصل ہر دلعزیزی کی قیمت پر ضائع نہ کرنا چاہتا تھا،

ملا نصر الدین چین کیسے پہونچے اپنے ٹٹو پر یا لطائف کے رخش سبک گام پر چینیوں نے ملا کی وطنیت بدل کر انہیں اپنی شہریت دیدی ملا کے مذہب ومشاغل پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ مگر ان کے لطائف کو چینی رنگ میں پیش کرکے یہ دعویٰ کردیا کہ .. ملا چین کا باشندہ تھا ..

چینی زبان میں ملا کے لطائف پر کئی کتابیں ہیں

چینی عوام ملا نصیر الدین ادنتی کے لطائف سے اتنے ہی واقف ہیں جتنے ہندوستان ترکی، ایران، عرب اور روس کے عوام .. ملا نصر الدین .. کے لطائف سے آشنا ہیں چین کا دعویٰ صرف پانچ سو سال پرانا ہے جبکہ ترک ملا کا وجود میں آنا سات سو سال پہلے بتاتے ہیں۔ ایران اور عرب بھی اس مدت پر متفق ہیں روسی اس مدت

کو تقریباً چھ سو سال بتاتے ہیں جب کہ ہندوستان میں یہی روایتیں، حکایتیں قصے اور لطیفے ایک ہزار سال سے زائد کی تاریخ رکھتے ہیں اور ان حکایتوں اور عوامی قصوں میں بعض کا زمانہ اس سے کہیں طویل ہے جبکہ بعض حکایتوں کی جھلک پنچ تنتر، جاتک کہانیوں اور ہندوستان کی دوسری لوک کہانیوں میں مل جاتی ہے۔

ملا نصر الدین کے لطیفے غالباً روس اور وسط ایشیا کا سفر طے کر کے چین، پہونچے ہوں گے مگر ملا کا چین میں پیدا ہونا قرین قیاس نہیں ہم ادنتی کو ملا کا زیادہ سے زیادہ سرقہ یا توارد قرار دے سکتے ہیں۔ یہ ایک مستعار کردار ہے جس کو انھوں نے اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔

ان لطائف کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ "ادنتی" کے نام سے منسوب تقریباً سب ہی لطائف ہندوستانی لطائف کے قدیم سرمایہ میں "ادنتی" سے بہت پہلے سے محفوظ ہیں "ادنتی کے لطائف بھی دیکھیئے:۔

ایک گائے بکاؤ ہے

ملا نصیر الدین ادنتی کی بیوی نے فیصلہ کیا کہ بیکار اور بد مزاج گائے کو فروخت کر دیا جائے۔ لہٰذا اس گائے کو لیکر ادنتی بازار پہونچا، خریدار آنا شروع ہوئے ادنتی گائے کے فضائل یوں بیان کر رہا تھا

"آپ کو دودھ نہیں دے سکتی، سینگ مار سکتی ہے"

اس سفارش پر بھلا کون گائے خریدتا۔ ایک مویشیوں کا تاجر ادنتی کی سادہ لوحی پر بہت دیر سے محظوظ ہو رہا تھا وہ پاس آیا اور گائے فروخت کرنے کے لیئے اپنی خدمات پیش کیں۔ ادنتی نے خوشی خوشی گائے اسکے حوالہ کر دی

کر دی۔

تاجر نے آواز لگانا شروع کی

"دیکھئے کتنی سیدھی گائے ہے! ہر روز بندرہ بالٹیاں دودھ دیتی ہے"
اسے خرید کر آپ بہت خوش ہوں گے۔"

یہ سن کر ادنتی نے گائے کی رسی تاجر کے ہاتھ سے چھین لی اور کہنے لگا!
اگر یہ گائے سیدھی بھی ہے اور اتنا دودھ بھی دیتی ہے تو کیوں بیچوں!
ادنتی گائے لیکر گھر واپس آگیا"

مکان بدلنا

ایک رات کئی چوروں نے ادنتی کے مکان پر دھاوا بول دیا انھوں نے جلدی جلدی تمام سامان باندھا اور چل دیئے انکے پیچھے ادنتی بھی باقی چھوٹی موٹی چیزیں اٹھاکر چلنے لگا

چوروں نے اسے دیکھ کر پوچھا؟

ادنتی اتنی رات گئے کہاں جارہے ہو؟ ادنتی نے جواب دیا۔

"عرصہ سے مکان بدلنے کا ارادہ کررہا تھا۔ لیکن سامان لے جانے کیلئے گاڑی نہیں مل رہی تھی آپ لوگوں کا کرم ہے کہ میری مدد کر رہے ہیں۔

غلطی میری ہے

ایک رات ادنتی قبرستان سے گذر رہا تھا۔ سامنے سے کچھ سوار سرپٹ چلے آرہے تھے انہیں ڈاکو سمجھ کر ادنتی ایک تازہ کھدی ہوئی قبر میں گھس گیا سواروں نے چھپتے ہوئے دیکھ لیا اور ڈپٹ کر پوچھا۔

"کون ہے ۔؟" ادنتی نے سر نکال کر کہا۔

"اس قبر کا مردہ ہوں۔"

"مردہ اس وقت قبر سے نکل کر کیا کر رہا تھا؟"

"ہوا خوری!"

"کیا مردے کو بھی ہوا خوری کی ضرورت ہوتی ہے؟"

"خوب یاد دلایا، معاف کیجئے گا، مجھے یاد نہیں رہا تھا۔ غلطی میری ہے"

یہ کہتا ہوا ادنتی قبر کے اندر کھسک گیا۔

ایران میں ملّا نصر الدین کے لطیفے انگریزی سے فارسی میں ترجمہ ہو کر پہونچے۔ اہل ایران سے ملّا نصر الدین کا تعارف کرانے کا سہرا ڈاکٹر ملنگ کے سر ہے۔ ملّا نصر الدین کے لطائف پر اب فارسی میں کئی کتابیں موجود ہیں ملّا نصر الدین کے کردار پر ایران کے اثرات بھی پڑے اس لئے ایران میں ملّا کے جو لطیفے بہت مقبول ہیں ان پر ایران کی خاصی گہری چھاپ ہے۔ ملّا کا ایرانی روپ بھی دیکھئے۔

بلبل کی ایک قسم

ایک دن ملّا نصر الدین ایک باغ میں گھس کر شفتالو توڑنے لگے۔ باغبان نے دیکھ لیا اور ملّا کے پاس آکر کہنے لگا۔

"شرم نہیں آتی۔ اتنے بڑے ہو گئے اور شفتالو چرا رہے ہو؟" ملّا نے کہا "شاید تمہیں معلوم نہیں کہ میں بلبل ہوں اور بلبل کسی بھی درخت کا پھل توڑ سکتا ہے"

یہ عجیب و غریب جواب سن کر حیران ہوتے ہوئے باغبان نے کہا۔

"اگر بلبل ہو تو پھل کھاتے میں نغمہ سرائی کیوں نہیں کرتے۔؟"

ملاّ نے یہ سن کر دو تین کر یہہ قسم کی آوازیں منہ سے نکالنے کے بعد کہا۔
,,بس اب تمہاری تسلی ہو گئی ۔ ؟،، باغبان نے ہنستے ہوئے کہا ۔
,,سُبحان اللہ۔ ۔ ایسی بھونڈی آواز تو آج تک نہیں سنی ۔،، ملاّ نے کہا ۔
,,شاید تمہیں معلوم نہیں کہ بلبلوں کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں اور انہیں سے ایک قسم یہ بھی ہے۔

قربانی لازم ہے

ملاّ کی بیوی نے ایک دن ملاّ کی قمیص سکھانے کے لئے چھت پر پھیلائی تیز ہوا کے جھونکے میں قمیص نیچے زمین پہ جا گری ۔
ملاّ نے بیوی سے کہا ۔
میں چاہتے کہ میرا صدقہ ادا کر دو اور فوراً ایک گوسفند ذبح کراؤ
ملاّ کی بیوی نے وجہ پوچھی تو جواب دیا ۔
" احمق اس لئے کہ اگر میں قمیص پہنے ہوتا یعنی قمیص کے اندر ہوتا تو اس وقت تک کبھی کا راہی ملک بقا ہو چکا ہوتا ۔ لہٰذا قربانی لازم ہے،،

مُفکّر

ایک دفعہ ملاّ طہران کے بازار سے گذر رہے تھے ایک جگہ مجمع دیکھ کر اس میں گھس گئے ایک طوطے پر بولیاں لگ رہی تھیں ۔ دیکھتے دیکھتے ایک شخص کے نام پچاس دینار پر بولی چھوٹ گئی ۔
دوسرے دن ملاّ بھی ایک موٹی تازی مرغی بغل میں داب کر پہنچے اور نیلام کرنے والے سے کہا ۔ اسے نیلام کر دو ۔ ،،
بولی شروع ہوئی مگر ایک دینار سے آگے نہ بڑھی ، اس پر ملاّ کو حیرت ہوئی اور اس نے غصے میں آکر چلاّنا شروع کیا ۔

"ارے کم بختو! کل تم نے ایک چھوٹا سا طوطا ۵۰ دینار میں خریدا اور آج تم اس موٹی تازی مرغی کو ایک دینار میں خریدنے پر تلے ہوئے ہو۔ آخر یہ کیا ڈھنگ ہے۔؟" لوگوں نے قہقہہ مار کر کہا۔

"ملّا صاحب اس کی وجہ تو ایک بچہ بھی بتا سکتا ہے۔"

"ملّا نے طیش میں آکر کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس طوطے میں ایسی کونسی خوبی تھی جو میری اس مرغی میں نہیں ہے۔" لوگوں نے بھی گرم ہو کے کہا۔

"طوطے میں یہ خوبی ہے کہ وہ باتیں کرتا ہے۔"

"یہ سن کر ملّا قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور بولا

"ارے بیوقوفو! میری مرغی سوچ سکتی ہے۔ یہ مفکّر ہے۔!"

ترکوں کو ملّا نصر الدین کی شخصیت کے بارے میں صحیح معلومات نہیں بعض ترک محققین کا کہنا ہے کہ ملّا کا وجود افسانوی ہے اور بعض کا دعویٰ ہے کہ آج سے ۷سو برس پہلے پیدا ہوا تھا۔ اکثر کا اصرار ہے کہ نام کچھ ہو مگر کوئی نہ کوئی ایسی ہستی ضرور موجود تھی جو ملّا نصر الدین کے نام سے مشہور رہوئی۔ اور وہ جس کو ترکی کا بچہ بچہ ملّا نصر الدین کے نام سے جانتا ہے۔ ترکی کے ہر شعبۂ زندگی میں ملّا نصر الدین کو بڑی اہمیت حاصل ہے علمی، ادبی، فنّی، تہذیبی، معاشرتی، سیاسی اور تجارتی مسائل جب الجھ کر سنگین صورت حال پیدا کر دیتے ہیں تو ملّا کی ایک شگفتہ مسکراہٹ ساری الجھن کو دور کر دیتی ہے۔ ملّا نصر الدین کی پرانی باتیں آج بھی اپنی تروتازگی سے نئی شگفتگی پیدا کر دیتی ہیں۔

ترک محققین کے بیان کے مطابق ملّا نصر الدین ہدی ترکی کے صوبۂ قونیہ کے شہر اک شہر کے قصبہ کا شہر کے ہور تو گاؤں میں ۱۲۰۸ء میں پیدا ہوا۔ ہدی

کا باپ مولوی عبداللہ گاؤں کی مسجد کا امام تھا۔

بچپن ہی سے نصرالدین کی ظرافت اور حاضر جوابی کے خصائص ابھرنے لگے تھے۔ ایک استاد نے سب شاگردوں کو مکتب ٹھیک ٹھاک کرنے کا حکم دیا مدرسہ کی صفائی کے بعد استاد نے فرداً فرداً ہر شاگرد سے پوچھا کہ "اس نے کیا کام کیا ہے۔؟" نصرالدین نے کہا۔

"کچھ بھی نہیں۔ میں دوسروں کو کام کرتے دیکھتا اور ہنستا رہا"

استاد ہنستے شاگرد کا یہ جواب سن کر حیرت زدہ رہ گیا اور کچھ دیر کے غور و فکر کے بعد اس نے کہا۔

"اچھا میں تمہیں یہ سزا دیتا ہوں کہ جب تک دنیا قائم ہے لوگ تم پر ہنسیں گے"

ملا نصرالدین کے استاد کی اس پیشین گوئی کو آج سات سو سال گذر چکے ہیں اور لوگ برابر ملا پر ہنس رہے ہیں۔

زمانے کے لحاظ سے مولوی عبداللہ نے نصرالدین کو بہت اچھی تعلیم دلوائی۔ نصرالدین جوان ہو کر اپنے زمانے کے عالموں میں شمار ہونے لگا۔ اور اسی حیثیت سے "خواجہ ملا" کا لقب پایا۔

ملا اپنے گاؤں کا قاضی ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین شاعر اور فلسفی بھی تھا وہ بہت صاف ستھرا خوش پوشاک اور خوش مزاج انسان تھا۔ بڑی سے بڑی بات ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز میں اس طرح کہہ دیتا تھا کہ نہ صرف سننے والوں کے دلوں پر بہت اثر ہوتا بلکہ ملا کی بات ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر لیتی۔

بعد میں ملا شہر کے منصف بھی بنا دیئے گئے۔ بیچ بیچ میں ملا مختلف پیشے اختیار کرتے رہے اور سیاحی کا سلسلہ بھی جاری رکھا مگر زیادہ تر ملا اپنے گاؤں میں رہتے جو انکو اپنا دوست مشیر راز دار سمجھتے اور انہیں گھیرے رہتے

ملاّ نے ۷۰ برس کی زندگی پائی ۔ مرنے سے قبل اپنے استاد کے قول کی لاج رکھنے کے لئے یہ وصیت کی کہ :۔

میری قبر پر ایک ایسی یادگار قائم کی جائے جس کو دیکھ کر لوگ ہنس پڑیں۔

یہ یادگار واقعی ایسی ہے کہ دیکھ کر بے اختیار ہنسی آجاتی ہے ۔ ملاّ کی وصیت تھی کہ میری قبر کے پائینتی لوہے کا ایک مضبوط دروازہ بنوا دینا جسمیں بہت بڑا سا قفل پڑا ہو لیکن قبر کے گرد نہ کوئی چہار دیواری ہو اور نہ کوئی چھت قبر کے اوپر بنائی جائے ۔،،

ملاّ کی یہ عجیب و غریب قبر آج بھی قصبہ کا شہیر میں گذشتہ سات چھ سو برس سے لوگوں کو ہنسانے میں مصروف ہے

ترکی میں ملاّ کے لطائف ،، کامن سینز ،، کی علامت بن چکے ہیں

روزمرہ کے معمولی معمولات سے عالمی مسائل تک عوام سے لیکر دانشور طبقہ تک انھیں لطائف کی مدد سے حل کرتا ہے اس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ معاملات سلجھنے کے ساتھ ساتھ عام دلچسپی اور خوشگوار فضا بھی برقرار رہتی ہے ۔

ترکی میں وقت ، حالات اور ضرورت کے تحت ملاّ کے لطائف میں آج بھی وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہتا ہے ۔ ملاّ کے سیاسی اور نئے رنگ کے لطیفے اسی زمانے کی پیداوار ہیں کہ ترکی میں ملاّ کے نئے لطائف اس کثرت سے تراشے گئے ہیں کہ اب یہ پتہ لگانا آسان نہیں کہ ان میں کون اصلی ہے اور کون نقلی ۔ لیکن انھیں لطائف کی مدد سے ترک اپنے قومی اور بین اقوامی مسائل حل کرنے میں مدد لیتے ہیں ۔ مثلاً حال میں بعض ممالک کو صنعتی امداد دینے کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے ایک بین اقوامی کانفرس ہوئی جس میں یہ طے نہ ہوسکا کہ امداد کس طریقے پر دیجائے آخر کار ترکی نمائندہ اٹھا اور بولا ۔ ،، حضرات اس موقع پر آپ کو اپنے ملک کے روایتی عقلمند ظریف

ملا نصر الدین کا ایک لطیفہ سناتا ہوں ــــــ

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ملا نصر الدین نے ایک قصاب کی دوکان سے تازہ کلیجی خریدی اور گھر کی طرف چل پڑا ۔ ملا کی بیوی کلیجی پکانے کی بہترین ترکیب جانتی تھی اور سارے ملک میں اس کی دھوم مچی ہوئی تھی کہ ملا کی بیوی بڑی لذیذ کلیجی بناتی ہے ۔ چنانچہ ملا اس مزے دار کلیجی کے تصور میں چٹخارے لیتے ہوئے چلے جا رہے تھے ۔ اچانک آسمان کی پہنائیوں سے ایک عقاب کی نظریں اس کلیجی پر پڑیں اس نے غوطہ لگایا اور جھٹا مار کر ملا کے ہاتھوں سے کلیجی اڑا لے گیا لیکن ملا پریشان ہوا اور نہ گھبرایا ۔ بلکہ مسکرا کر اس نے عقاب کو آواز دی اور کہا ۔

" تم کلیجی تو لے جا رہے ہو لیکن اس کے پکانے کی ترکیب بھی معلوم ہے ۔ ؟

اس لطیفے کے بعد کانفرس کے مندوبین نے اس موضوع پر مزید بحث کی ضرورت نہ سمجھی اور بات ختم ہو گئی ۔

ترکی میں اس قسم کے بھی ملا کے لطیفے بہت عام ہیں جو ظاہر ہے کہ اسی زمانے کی ایجادیں ہیں

" ملا اور اس کے دوست پکنک کے دوران ایک گول میز کے گرد بھنی مچھلی اور لیموں اڑا رہے تھے ۔ تین چار آدمیوں نے منہ لگایا تو لیموں کی بوتل صاف ہو گئی مگر ملا رسمی طور پر دوسرے دوستوں کو بھی بوتل پیش کرتا رہا ۔

ایک پہلوان نے بوتل لگا کر منہ سے کوشش مگر لیموں کا ایک قطرہ نہ نکلا ۔ اس لئے ایک بہت دبلے پتلے آدمی کو بوتل تھما دی ۔ اس نے جیسے ہی بوتل سے منہ لگائی تو اس میں سے رس کی دھاریں ابل پڑیں سب حیران ہو گئے ۔ ملا بولا ۔

" میاں اس میں حیرانی کی کیا بات ہے ۔ ہ تمہیں یاد نہیں کہ یہ دبلا پتلا شخص ممی تھا

ٹیکس وصول کرنے والا ہے

ڈاکٹر کو دکھاؤ

ایک دن ملاّ کی بیوی نے ملاّ کے خوفناک خراٹوں سے تنگ آکر ملاّ سے کہا
,, تم نیند میں اسقدر خراٹے کیوں لیتے ہو۔ ؟ اگر یہ کوئی بیماری ہے تو ڈاکٹر کو دکھاؤ اور خراٹے بند کرنے کا انجکشن لگواؤ۔ ،،

ملاّ نے کہا۔

تم نے پرسوں رات بھی مجھ سے یہی بات کہی تھی تو محض یہ دیکھنے کے لیے میں جاگتا رہا کہ میں خراٹے لیتا ہوں یا نہیں ؟ مگر میں نے اپنا ایک بھی خراٹا نہیں سنا البتہ تم ضرور خراٹے لے رہی تھیں۔

آزاد شاعری

کسی مشاعرے میں لوگوں نے ملاّ سے بھی فرمائش کی. ملاّ نے کہا۔
,, میں بہت بڑا شاعر ہوں ،، اس کے بعد ملاّ نے کوئی بڑی بے تکی سی چیز سنائی۔
لوگوں نے کہا ـــــ ,, ملاّ یہ کیسے شعر تھے جن میں نہ وزن نہ قافیہ نہ ردیف نہ معنی! ؟ ملاّ نے کہا۔

آپ سچ کہہ رہے ہیں میں اصل میں اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گیا ہوں ایک زمانہ آئے گا جب لوگ آزاد شاعری کیا کریں گے اور ہر بے معنی چیز کو شعر کہیں گے۔ اس زمانے میں مجھ جیسے شاعر صاحب دیوان ہوا کریں گے۔

اب ملاّ نصرالدین کا ترکی روپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

ایک من کا پیمانہ

ہوا خوری کے دوران اتفاقاً ملاّ کے ہاتھ ایک خرگوش لگ گیا انھوں نے اسکو

توبڑے میں بند کرلیا اور بیوی سے کہا۔

"میرے ہاتھ ایک بہت قیمتی جانور لگ گیا ہے میں اسے کسی بہت بڑے تاجر کے ہاتھ فروخت کر کے بہت سا روپیہ کماؤں گا۔ مگر جب تک میں نہ آؤں تم اس توبڑے کا منھ نہ کھولنا۔ ملّا کے جانے کے بعد انکی بیوی نے اس خیال سے کہ دیکھیں تو کہ آخر توبڑے میں وہ کونسا جانور ہے جس کو بیچ کر ملّا دولتمند ہو جائیگا۔ توبڑا کھلتے ہی خرگوش قلانچیں بھرتا ہوا ہوا ہو گیا۔ بیوی نے ملّا کے خوف سے اناج ناپنے کا برتن توبڑے میں ڈالکر اس کا منھ بند کر دیا۔ کافی دیر کے بعد ملّا ترکی کے چار پانچ سب سے بڑے تاجروں کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔ ملّا کے منھ سے تعریفیں سن سن کر اس عجیب و غریب جانور کو دیکھنے کے لیے بے قرار تاجروں کے سامنے ملّا نے توبڑے کا منھ کھولا۔ یہ دیکھ کر کہ اسمیں خرگوش کے بجائے اناج ناپنے کا برتن ہے ملّا کا منھ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ ان شریف آدمیوں کو کیا جواب دے۔ آخر ان سب کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"جناب اس برتن کو اگر تین مرتبہ غلّے سے بھرا جائے تو پورا ایک من ہو جاتا ہے۔

حلوہ

ملّا نصرالدین کو حلوہ بہت پسند تھا جو ترکی کی مرغوب غذا ہے۔ انھوں نے ایک دن ایک بنیئے کی دکان پر جا کر پوچھا۔

"میدہ ہے۔؟

"ہے۔!

"گھی ہے۔؟

ور ہے ۔!

" کیا آپ کے پاس بادام ہیں ۔؟

" ہیں ۔!

" تو پھر آپ حلوہ کیوں نہیں بناتے ۔؟

چالیس سال پرانا سرکہ

ملّا کے گاؤں میں کسی نے پوچھا ۔

" ملّا سنا ہے کہ تمھارے پاس چالیس سال پرانا سرکہ ہے کیا تم تھوڑا مجھے بھی دوگے ۔؟

ملّا نے جواب دیا ۔

" اگر میں ہر شخص کو سرکہ دیتا رہتا تو یہ سرکہ چالیس سال پرانا کیسے ہوپاتا ۔؟

ہندوستان میں ملّا دوپیازہ کی قبر بھی اسی قسم کی ہے جیسی ترکی میں ملّا نصرالدین کی ہے

ملّا دوپیازہ کے نام سے منسوب لطائف اور ملّا نصرالدین کے نام سے مشہور لطائف میں حد درجہ مماثلت ہے ۔ اکبر اعظم کے نورتن میں ملّا عبدالقادر بدایونی اور مہیش داس بیربل میں دلچسپ نوک جھونک کی وجہ سے ملّا عبدالقادر کا نام ملّا دوپیازہ پڑ گیا ۔ ان دونوں کے لطیفے محض افسانوی حیثیت رکھتے ہیں انکے اور ملّا نصرالدین کے لطیفوں میں بہت کم فرق ہے لیکن ترک اور مغل دربار میں ربط ضبط اور مغل دربار میں ترکی شعر و ادب کے عام ذوق کے تحت یہ سوال اٹھتا ہے کہ یہ لطیفے ہندوستان سے ترکی گئے یا ترکی سے ہندوستان آگئے ؟ ملّا ہندوستان آئے تھے یا ہندوستان سے ترکی گئے تھے ۔؟ اس

گتھی کو سلجھانے میں تاریخ سے کوئی مدد نہیں ملتی مگر اس بنیاد پر کہ ملاّ کے نام سے منسوب بعض لطائف ۷سو سال سے بھی زیادہ پرانے ہیں اور ان کا تعلق ترکی سے زیادہ ہندوستانی حکایتوں، عوامی قصوں اور لوک کہانیوں سے ہے یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ملاّ کے کردار کو ترکی نے اپنا ضرور لیا۔ مگر اس کا ہندوستان سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ہندوستانی اور اردو لطائف میں ملاّ کی شخصیت پورے طور پر جلوہ گر ہے۔ اور ملاّ کا کردار اگر ہندوستانی نہیں ہے تو ان دونوں کیلئے اجنبی بھی نہیں ہے۔

ملاّ کا یہ روپ بھی دیکھئے۔

منافع

رات کے وقت ملاّ دریا کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے دس مسافروں نے ان سے کہا

"ہم کو دریا کے پار پہونچادو۔ ہم فی مسافر ایک پیسہ اجرت دیں گے۔"

ملاّ راضی ہو گئے۔ مگر ۹ آدمیوں کو دریا پار کرانے کے بعد ملاّ بالکل تھک گئے اور انھوں نے دسویں آدمی کو دریا میں ڈال دیا۔ مسافروں نے کہا

"ملاّ یہ کیا بدتمیزی ہے۔؟" ملاّ نے کہا

"میں نے آپ لوگوں کو ایک پیسے کا نقد نفع پہونچادیا اب آپ مجھے صرف ۹ پیسے عنایت کردیں آپ ایک پیسہ نفع میں رہے۔"

مہربانی

حلوائی کی دوکان پر پیٹ بھر مٹھائی کھائی جب حلوائی نے پیسے مانگے تو ملاّ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اور زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ مٹھائی

کھانا شروع کردی جب کافی ڈنڈے پڑ گئے تو ملا ہنس کر کہنے لگے۔
"بھئی یہاں کے لوگ کتنے نیک دل اور مہربان ہیں کہ غریبوں کو ڈنڈے مار مار کر مٹھائی کھانے پر مجبور کرتے ہیں۔

مردہ زندہ کرنے کا وعدہ

ملا بھوکے پیاسے ایک گاؤں میں پہونچے ایک گھر میں غمی ہو گئی تھی لوگ رو پیٹ رہے تھے۔ ملا نے ان سے کہا۔
"اگر آپ لوگ مجھے کھانا کھلادیں تو میں آپ کا مردہ زندہ کردوں۔
ملا کو خوب پیٹ بھر کر کھانا کھلایا گیا۔ اسکے بعد ملا نے پوچھا
"مرنے والا کیا کام کرتا تھا؟ لوگوں نے بتایا۔
"پٹواری تھا
ملا نے لوگوں کو بہت سخت وسست کہا اور بولے
"مجھے پہلے کیوں نہیں بتادیا کہ یہ شخص پٹواری تھا اگر کوئی اور ہوتا تو میں اسے فوراً زندہ کردیتا مگر پٹواری تو زندگی میں صرف ایک بار مرتا ہے اسے میں کیا کوئی بھی زندہ نہیں کرسکتا۔

بینگن

ایک دن ملا کا لڑکا لوگوں سے بینگن کی تعریف کر رہا تھا
"بس یوں سمجھئے۔ خرگوش کے بچے ... جس نے ابھی آنکھ نہیں کھولی ہے
ملا نے کہا۔
" صاحبان نے یہ نہ سمجھئے گا یہ تعریف اس نے سیکھی ہے۔ ہرگز نہیں یہ تو اسکی اپنی تحقیق ہے

وہ بھی ٹوٹ جائے گی

ملا نے اپنے بیمار دوست کی طبیعت پوچھی۔ دوست نے کہا۔

"بخار تو ٹوٹ گیا ہے مگر گردن میں سخت درد ہے۔ ملا نے ہمدردی کرتے ہوئے کہا
"گھبراؤ نہیں، اللہ نے چاہا تو جیسے بخار ٹوٹا ہے ویسے ہی گردن بھی ٹوٹ جائے گی

کپاس کی کاشت

ملا ایک نائی کے پاس داڑھی بنوانے گئے۔ نائی بالکل اناڑی تھا ملا کا چہرہ لہولہان ہو گیا
آدھے چہرے کی حجامت بنانے کے بعد نائی نے ملا کے منہ پر خون کے فوارے روکنے کے
لئے جگہ جگہ روئی کے پھائے لگا دیئے ملا نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے کے بعد کہا۔
"بس باقی رہنے دو میرے خیال میں آدھے چہرے پر اب میں خود کپاس اگا لوں گا۔

جیسے کو تیسا

ملا اپنے مکان کی چوتھی منزل پر تھے کہ ایک سائل نے ملا کو نیچے بلایا اور کہا
"میں سائل ہوں میری کچھ مدد کی جائے
ملا سائل کو اپنے مکان کی چوتھی منزل پر لے گئے اور بتایا۔
"میں آپ کی فی الحال کوئی مدد نہیں کر سکتا

کلّے پائے

ملا گھر جا رہے تھے ایک شخص نے کہا
"ملا آج تمہارے پڑوس میں کلّے پائے پکے ہیں
ملا نے کہا
"مجھ سے کیا مطلب؟" اس نے کہا
"لیکن اس نے تمہارے یہاں بھی بھیجے ہیں" ملا نے کہا۔

"تم سے کیا مطلب"

بنئے کو جواب

مُلّا بنیئے کے ۵۲ روپئے کے قرضدار تھے۔ اس نے انکے دوست کے سامنے سر بازار تقاضا کرتے ہوئے کہا۔

"یا ابھی میرے روپئے دو ورنہ میں تمھیں سر بازار رسوا کر دونگا۔ ملّا نے غصہ ہوکر پوچھا"

"تمھارے کتنے روپئے باقی ہیں؟"

"باون۔" ملّا نے کہا

"۲۸ روپئے تمھیں کل دیدونگا۔ بیس روپئے پرسوں ادا کر دونگا باقی کتنے روپئے رہجائیں گے۔؟"

"چار روپئے"۔۔۔۔ "بہت خوب" ملّا نے چلّا کر کہا۔

"بندہ تمہیں شرم آنا چاہیئے تم صرف ۴ روپئے کیلئے مجھے بازار میں رسوا کرنا چاہتے ہو۔"

ایک ٹانگ کا مرغا

حاکم شہر کے لئے ملّا مرغا بھنوا کر لیجا رہے تھے راستے میں بھوک لگی تو ایک ٹانگ کھالی حاکم نے مرغا دیکھ کر پوچھا۔

"ایک ٹانگ کیا ہوئی؟" ملّا نے کہا۔

"ہمارے یہاں مرغے کی صرف ایک ٹانگ ہوتی ہے۔"

اتفاق سے دو تین مرغے ایک ٹانگ سے کھڑے تھے۔ ملّا نے کہا۔

"وہ دیکھئے!" حاکم نے دیکھنے کے بعد ملازم سے کہا

"ایک مرغ پکڑ لاؤ۔"

ملازم نے ایک چھڑی ماری مرغا لنگڑا ہو گیا ۔ حاکم نے کہا
"ملا اس کے دو ہی ٹانگیں ہیں نہ" ؟ ملا نے کہا ۔
" یہ چھڑی اگر آپکے پڑ جائے، تو آپکے بھی دو کے بجائے چار ٹانگیں ہو جائیں "

دروازے کی حفاظت

ملا کی ماں اپنی سہیلی کے پاس جا رہی تھیں انھوں نے چلتے وقت تاکید کی
"جب تک واپس نہ آجاؤں تم گھر کی حفاظت اور دروازے کی اچھی طرح رکھوالی کرنا"
ملا دروازے کی رکھوالی کر رہے تھے کہ انکے خالہ نے کہلوایا کہ وہ آرہی ہیں ۔
ملا عجیب مصیبت میں پھنس گئے دروازے کی رکھوالی بھی ضروری تھی اور ماں کو پیغام پہونچانا بھی ۔ ایک ترکیب سوجھ گئی انھوں نے دروازہ چوکھٹ سے نکال لیا اور کندھے پر رکھکر ماں کے پاس پہنچ گئے ۔ ماں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا ۔
"یہ کیا حرکت ہے دروازہ کیوں اکھاڑ لائے ۔ ؟ " ملا نے کہا ۔
" آپکو یہ آکر بتانا ضروری تھا کہ خالہ نے گھر آنے کے لئے کہلوایا ہے اور آپکے حکم مطابق دروازے کی رکھوالی ضروری تھی ۔ لہٰذا احتیاطاً دروازہ اپنے ساتھ لایا ہوں "

اردو لطائف کی کتابوں میں ملا کے اس قسم کے بیشمار لطائف ہندوستانی رنگ میں موجود ہیں جو دیوار قہقہہ ، ہنسی کا گول گپا ، ہنسی کا پٹارہ ، تحفۂ محفل مجموعۂ لطائف ، لطائف وظرائف ، حدیقۂ ظرافت اور نوادر وغیرہ میں ملا نصر الدین ملا دوپیازہ ، بیربل ، شیخ چلی ، اور لال بجھکڑ وغیرہ کی شکل میں جا بجا جلوہ گر نظر آتے ہیں ۔

غالب کے ایک ممتاز کارٹونسٹ وہاب حیدر

کلام غالب کی شرح کا سلسلہ مرزا کے سامنے ہی شروع ہو گیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مرزا کے رنگا رنگ کلام کی شرحیں بھی ہر رنگ میں کی گئیں۔ اس تنقید، تعریض اور تحریف میں افراط و تفریط کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ کسی نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ مرزا کا کہا یا مرزا خود سمجھ سکتے ہیں یا خدا سمجھ سکتا ہے۔!

ع مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے۔

اور کسی نے اسے ”الہامی کتاب“ قرار دیا۔ غرض تعریضیں بھی کی گئیں اور خاکے بھی اڑائے گئے۔ آغا جان عیشؔ سے فرقت کاکوروی تک ہر قسم کی شرحیں نظر آئیں گی۔ ان تحریفات کا رنگ وہاں زیادہ تیکھا ہو گیا ہے جہاں اشعار غالب پر کارٹون یا کارٹون پر اشعار غالب چسپاں کئے گئے ہیں۔

غالب پر کارٹونوں کی باقاعدہ ابتدا ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ لکھنؤ سے ہوئی یہ سلسلہ ۱۹۳۹ء تک چلتا رہا۔ منشی سجاد حسین کے بعد ممتاز حسین عثمانی، ظریف لکھنوی اور عثمانی صاحب کے صاحبزادے باقر صاحب کے دم آخر تک اودھ پنچ میں سیاسی، سماجی اور ادبی مسائل پر گاہے بگاہے غالب اور انکے اشعار کارٹون کئے جاتے رہے۔ یہ کارٹون معاصر رسائل اخبارات میں ہمیشہ ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ نقل بھی کئے گئے۔ اور علیحدہ سے بھی پیش کئے گئے۔

مختلف کارٹونسٹ وقتاً فوقتاً مرزا کے کارٹون بھی پیش کرتے رہے مگر اس دوران ہمیں کوئی ایسا کارٹون ساز نظر نہیں آتا جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جا سکے کہ وہ محض غالب ہی کے کارٹونسٹ تھے میری اب تک کی معلومات

کے مطابق یہ شرف صرف وہاب حیدر کو حاصل ہے کہ وہ غالب کے کارٹونسٹ تھے۔ انھوں نے زندگی بھر اشعار غالب کی شرح اپنے کارٹونوں میں کی۔ اس اعتبار سے وہ غالب کے بہت ہی ممتاز کارٹونسٹ کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے۔

غالبیات کے باب میں وہاب حیدر ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے مرزا کے لیے زندگی وقف کر دی تھی۔ وہ زندگی بھر غالب کے کارٹون بناتے اور کارٹون کے ذریعہ اشعار غالب کی تشریح کرتے رہے۔

وہاب حیدر اسی زمانے کی پیداوار تھے مگر اس کے باوجود ہمیں انکے زیادہ حالات نہیں۔ وہاب حیدر کے جو کچھ حالات میں فراہم کرسکا انکی بنیاد — قیام حیدرآباد کے دوران ان سے ملاقاتیں جن میں میں نے ان سے انکے بارے میں تفصیلات فراہم کیں۔ دوسرے ان کی کتاب "شہر پہ شوشہ"، تیسرے روزنامہ "سیاست" حیدرآباد اور روزنامہ "انقلاب" بمبئی جن سے وہ زیادہ تر وابستہ رہے۔ اور انکے بارے میں شائع ہونے والے مضامین چوتھے ان اخبارات میں غالب پر انکے مسلسل شائع ہونے والے کارٹون جن کی مدد سے میں نے انکے فن پاروں کے نمونے جمع کیے۔ پانچویں مرزا غالب پر تحریفات کا مجموعہ "غالب سے معذرت کے ساتھ"، جن میں مرزا پر باغ و بہار کارٹون بھی ہیں جو وہاب حیدر کے بنائے ہوئے ہیں۔

وہاب حیدر غالب کے زبردست مداح اور غالب ہی کی طرح خستہ حال بھی تھے۔ بیمار اور پریشان تھے۔ مگر بیماری اور پریشانی دونوں انکی اپنی پیدا کی ہوئی تھیں۔ وہ خود کو تقریباً غرق مئے ناب کیے ہوئے تھے۔ ان سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان کا بھی وہی انجام ہوگا جو ان سے پیشتر اختر شیرانی، منٹو

اور مجاز کا ہو چکا ہے۔ لوگ انھیں چاہتے تھے انکے فن کو سراہتے تھے مگر ان سے مایوس تھے۔ وہاب حیدر شکل وصورت چال ڈھال لب ولہجہ کے اعتبار سے خالص حیدر آبادی تھے۔ مگر ان پر ایک تہہ بمبئی کی چڑھ چکی تھی۔ بہت ہی سادہ، بااخلاق اور وضعدار قسم کے انسان تھے۔ ہر فنکار کی طرح یہ بھی اپنے بارے میں بے تکلفی سے باتیں کرتے اپنی تعریف سے خوش ہوتے۔ اپنی پریشانیاں بتاتے اور اسی سادگی سے ان زحمتوں کو بھی بیان کر جاتے۔ جو انکی وجہ سے دوسروں کو ہوتیں۔ زندگی سے مایوس ہونے کے باوجود بیحد زندہ دل اور خوش مذاق انسان تھے۔ بمبئی واپس جاکر کسی اخبار یا ادارے سے مستقل طور پر وابستہ ہو جاتے، شراب چھوڑ دیتے اور اپنے دوسرے اہم مسائل کے بارے میں اپنی لمبی چوڑی اسکیمیں بتاتے۔

اپنی والدہ احمد النساء بیگم جو باحیات ہیں اور اپنے بھائی مجید عبدل کے بہت معترف تھے۔ اور اپنے فن میں بھی انکو اپنا استاد تسلیم کرتے۔

وہاب حیدر پیدائشی کارٹونسٹ تھے۔ انکو کسی نے اس فن کے بارے میں کوئی باقاعدہ تربیت نہیں دی۔ سوائے انکی والدہ کے۔

"ادب اور مصوری کا ذوق مجھکو اپنی محترم ماں ہی سے لڑکپن میں ملا تھا۔ انھوں نے مجھ کو نہ صرف برش پکڑنے کا سلیقہ سکھایا اور مختلف رنگوں کے حیرت انگیز امتزاج کی بصیرت عطا کی۔ بلکہ ادب اور مصوری کے جمالیاتی احساس سے بھی روشناس کیا تھا...... جب کارٹون بنانے کی نوبت آئی تو میں نے اپنے آپ کو اناڑی بھی نہیں محسوس کیا اس مرحلے پر ہنسنے اور ہنسانے والے مزاج نے ساتھ دیا اور میں نے کارٹون بنانے شروع کئے دیکھنے والوں

نے انھیں پسند کیا اور ہمت افزائی میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔

(شورش بر شورش ۲۷–۱۵)

دہاب حیدر نے کارٹونوں سے اپنے فن کی ابتدا کی۔ مصوری انھوں نے اپنی والدہ سے سیکھی۔ روزانہ اخبار کے لئے تیز رفتار زندگی کے بدلتے ہوئے حالات و واقعات پر کارٹون پیش کرتے وقت انھوں نے شعر و ادب سے اپنا رشتہ استوار رکھا۔ اپنے ہر کارٹون کی تشریح کیلئے غالب کے پھڑکتے ہوئے اشعار CAPTION کے طور پر استعمال کرنا شروع کئے۔ اس موقع پر غالب نے ان کا بہت ساتھ دیا۔ سب سے زیادہ سہارا انھیں دیوان غالب سے ملا۔ انھوں نے اس فن میں اس حد تک مشاقی بہم پہونچائی کہ کارٹون کا ساتھ دینے کے لئے شعر ڈھونڈھنے کے بجائے شعر کی کارٹونی تشریح کرنے لگے۔

دہاب حیدر کا تجربہ نیا نہ تھا مگر انھوں نے طریقہ کار نیا اختیار کیا۔ اور اسکو بہت جلد فن کی شکل دے دی۔ ادب، مزاح اور مصوری کے اس امتزاج نے انھیں غالب کے کارٹونسٹ کی حیثیت سے بہت جلد مشہور اور ممتاز کر دیا۔

ایک جگہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ کلکتہ میں قیام کے دوران انکے توام بھائی مجید عبدل نے فن کے سنوارنے اور نکھارنے میں انکو مدد دی۔

"کلکتہ میں میرے توام بھائی مجید عبدل نے ہر طرح ساتھ دیا انکی فطری بذلہ سنجی اور مصوری کی تخلیقی اپج اور دیرینہ ورزش دور تک میری رہنمائی کرتی رہی اور اس طرح خیال و خطوط کے اختلاط سے فن کا ایک نیا عکس سامنے آیا"

(دہاب حیدر کے کارٹون۔ روزنامہ انقلاب بمبئی ۱۲ ستمبر ۱۹۶۶ء)

بمبئی میں ۱۹۶۳ء میں انھوں نے غالب کے کارٹونوں کی نمائش کی۔ اس دوران

ایشیا کے مشہور مصور اے اے المیکر نے نمائش اور "شعر پہ شوشہ" کے لئے وہاب حیدر کا اسکیچ تیار کیا جو انکے مجموعہ میں شامل ہے۔

ممتاز مصور کرشن آرا نے غالب کے ان کارٹونوں کو کتابی شکل دینے کی کوشش اسی دوران کی۔

چنانچہ عباس سورتی کے تعاون سے یہ کتاب "شعر پہ شوشہ" کے نام سے ستمبر ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی۔ وہاب حیدر کے مرزا غالب پر سیکڑوں کارٹونوں میں پچاس منتخب کارٹون اس کتاب میں منتخب کئے گئے ہیں۔ غالب کے یہ کارٹون اردو کے ادبی اور صحافتی حلقوں میں اتنے مقبول ہوئے کہ ممتاز رسائل اور اخبارات نے انھیں فخر کے ساتھ اپنے یہاں نقل کیا۔ اور "شعر پہ شوشہ" کی مقبولیت نے بڑھ کر محاورے کی شکل اختیار کرلی۔ چنانچہ احمد، شوکت محمود، دلی اور دوسرے ممتاز کارٹون سازوں نے بھی بعد میں اسی عنوان کے تحت میرؔ، اکبرؔ، جوشؔ، جگرؔ، فراقؔ، مجازؔ اور فیضؔ وغیرہ کے کارٹون بھی پیش کئے ہیں۔

غالب پرستوں میں وہاب حیدر اس لئے اہمیت رکھتے ہیں کہ غالب سے لگاؤ میں نہ تو انھوں نے تقلید کی راہ اختیار کی اور نہ کہی ہوئی باتوں کو اپنے انداز میں دہرانے کی کوشش کی۔ بلکہ خود اپنی راہ الگ نکالی۔ انھوں نے مرزا کے اشعار کو کارٹونوں کے قالب میں بڑے حسن وخوبی سے ڈھالا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انھوں نے شعر کے میل سے کارٹون کی تخلیق کی۔ مرزا غالب کے یہ کارٹون ادب، مزاح اور مصوری کا بہت خوشگوار امتزاج پیش کرتے ہیں۔

وہاب حیدر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے زیادہ تر اشعار میں غالب ہی کو کارٹون کے قالب میں ڈھالا اور آخر دم تک یہ سلسلہ جاری رکھا۔ "سیاست" اور "انقلاب" سے وابستگی کے دوران دمہ کے مرض نے زور کیا۔ حیدرآباد

میں انھوں نے گلے کا ایک نازک آپریشن کرایا تھا۔ اس کے چند ماہ بعد وہ اپنے وطن سے بمبئی چلے گئے جہاں انتقال سے تین چار دن پیشتر بالکل تندرست تھے۔ دمے کے عارضے نے زور کیا انکو جی ٹی اسپتال میں داخل کیا گیا جہاں ، ستمبر ۱۹۶۶ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

غالباً غالب کے بعد انھیں سب سے زیادہ لگاؤ اسی شغل سے تھا چنانچہ انھوں نے اپنے آپ کو اسی کی نذر کر دیا۔

اردو انداز فکر لئے ہوئے کارٹون بہت عام ہیں مگر عام طور پر ان میں فنی گہرائی نہیں ہوتی۔ دوسرے مستعار خطوط وخیالات کی وجہ سے یہ اپنی ندرت اور انفرادیت کھو دیتے ہیں۔ وہاب حیدر کی خوبی یہ ہے کہ ان کی بنیاد سراسر اردو انداز فکر پر ہے۔ انکا خیال وخط ان کا اپنا ہے۔ غالب کے کارٹون پیش کرتے وقت نہ صرف انھوں نے جدت فکر سے کام لیا۔ بلکہ احتیاط اور توازن کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا انھوں نے غالب کو رنگا رنگ لباس وانداز میں ضرور پیش کیا مگر اسکے باوجود ہر تصویر میں غالب ہی نظر آتے ہیں۔ انکے علاوہ دوسری اور۔

،، کوئی صورت نظر نہیں آتی ،،

آپ نے دیوان غالب کے علاوہ غالبیات پر مختلف شرحیں اور کتابیں پڑھی ہوں گی۔ ایک ایک شعر کے مختلف معنی آپکے ذہن میں ہوں گے مگر جو معنی اور مطلب ،، شعر پہ شوشہ ،، میں وہاب حیدر نے پیش کئے ہیں شاید ان تک آپ کا ذہن رسا نہ پہونچا ہو۔

وہاب حیدر کے ان کارٹونوں میں ایک خاص جدت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اشعار غالب میں آج کی انسانی کمزوریوں اور مجبوریوں پر متوجہ کرنے اور انسانیت کی نبض پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اشعار غالب سے انھوں نے

طفلِ بے پروا کی طرح ہمارے زخموں پر نمک چھڑکنے کی بھی کوشش کی ہے
غالبؔ کی شخصیت کو ان کارٹونوں میں نہ مجروح کیا گیا ہے اور نہ کہیں
تحقیر کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ بلکہ انھوں نے ہر موقع پر پاسِ ادب کے علاوہ
مرزا کی خوش مذاقی اور زندہ دلی سے فائدہ اٹھایا ہے۔
غالب کو شعر پہ شوشہ ، میں کہیں بھی وہاب حیدر نے جسمانی طور پر مسخ یا معذور
کر کے نہیں پیش کیا ہے۔ یہ ہر ماحول میں مرزا کو شامل کر لیتے ہیں اور وہ بھی اس
طرح کہ مرزا کی حیثیت فالتو یا تماشائی کی نہیں بلکہ ہمیشہ بنیادی اور مرکزی کردار
کی رہتی ہے۔ اور اس کے ساتھ کہیں بھی اپنے ہیرو کی تحقیر یا ہجو کا موقع ہاتھ
آنے نہیں دیتے۔ غرض یہ کہ کارٹون میں مرزا کے وقار اور احترام کو برقرار رکھتے
ہیں۔ مرزا کے آئینے میں یہ آج کی خوشی اور غمی، مجبوری اور محرومی کو اس خوبی سے پیش کرتے
ہیں کہ حقارت اور نفرت کا اظہار کیے بغیر زندگی کی ایک جھلک پیش کر دیتے
ہیں۔ اس طرح ہمارے معاشرے کے غیر متوازن گوشے سامنے آجاتے ہیں۔
کارٹون کی لذت سے ہمارے دل شاد ہو جاتے ہیں اور دماغ کی کھڑکیاں
کھل جاتی ہیں۔
وہاب حیدر کے کارٹونوں کی بڑی فنی خوبی انکی واضح اور گہری معنویت
تصویری ترتیب اور سجاوٹ ہے انکے کسی بھی شعری کارٹون کے معنی بآسانی
ادا ہو جاتے ہیں۔
اس قسم کے کارٹون غیر رسمی انداز میں پیش کرنا بھی جوئے شیر لانے سے کم
نہیں۔ لیکن وہ شعر پہ شوشہ ، میں زندگی کے لمحات کو جس طرح سمیٹنے کی کوشش کی
گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاب حیدر نے نظم و نثر کے دامن سے غالبؔ
کی ابدی خلش اور لذتِ چبھن کو سمیٹ کر تصویر کے پردے میں عریاں کر دیا ہے

غالب سے نے بت طنّازنہ، نہ آغوشِ رقیب سے کے لیے پائے طاؤس پے خامہ مانی مانگا اس کے باوجود انھیں یہ احساس تھا کہ ،، کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا،، اور اگر مرزا عمر خضر لائے ہوتے تو اس مجموعے کو دیکھ کر یقیناً محسوس کرتے کہ وہاب حیدر کا موجودہ کاغذی پیرہن مختلف ہے۔ اور دلکش بھی۔

وہاب حیدر جلوۂ گل کے ذوقِ تماشہ کے لیے مرزا کیطرح چشم کو ہر رنگ میں وا کر رہنے کے قائل ہیں۔ گونا گوں زندگی کے نوع بہ نوع رنگوں اور انکی پرچھائیوں میں تہہ بہ تہہ احساسِ جمال اور واردات شعری اور قلبی کو،، شعر بہ شوشہ،، میں اسیر کرتے اور ذوقِ تماشا کی خاطر کارٹون کی شکل میں پیش کر دیتے۔

ان سے پہلے بھی اور انکے بعد بھی غالب کو کارٹون کی شکل میں پیش کرنے کا سلسلہ تھا۔ اور رہے گا۔ مگر یہ اس لحاظ سے اپنے فن کے موجد اور خاتم ہیں کہ انھوں نے اپنے آپ کو غالب کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے غالب پر عمل کر کے دلآویز اور ہمہ گیر ہوتے انھیں کارٹونوں کی شکل میں پیش کر دیئے۔

آرٹ روایتی ہو یا تجریدی ہر رنگ اور روپ میں انکے ،، غالبی تجربات،، میں آپکو ،، نقشِ فریادی،، سے لیکر ،، مورس کوڈ،، اور ایرانی ہوٹل کی آئینہ بندی تک ان کا انفرادی رنگ و آہنگ مل جائے گا۔ جاسوسی ناولوں کی بھول بھلیاں کن محویت سے چاند کے راکٹ کی جانب پرواز تک اور ،، وینس ڈی میلو،، سے ،، دیوارِ گریہ،، کی تاریخ تک شعور اور ارتقا، کی کڑیوں سے کڑیاں مل جائیں گی۔

....

آرائش خم و کاکل ،،میں،، پونی ٹیل ،،کا اندیشہ ہائے دور دراز پیدا کرنا انہی کا کام ہے اور ،،پونی،، کا تو جواب ہی نہیں
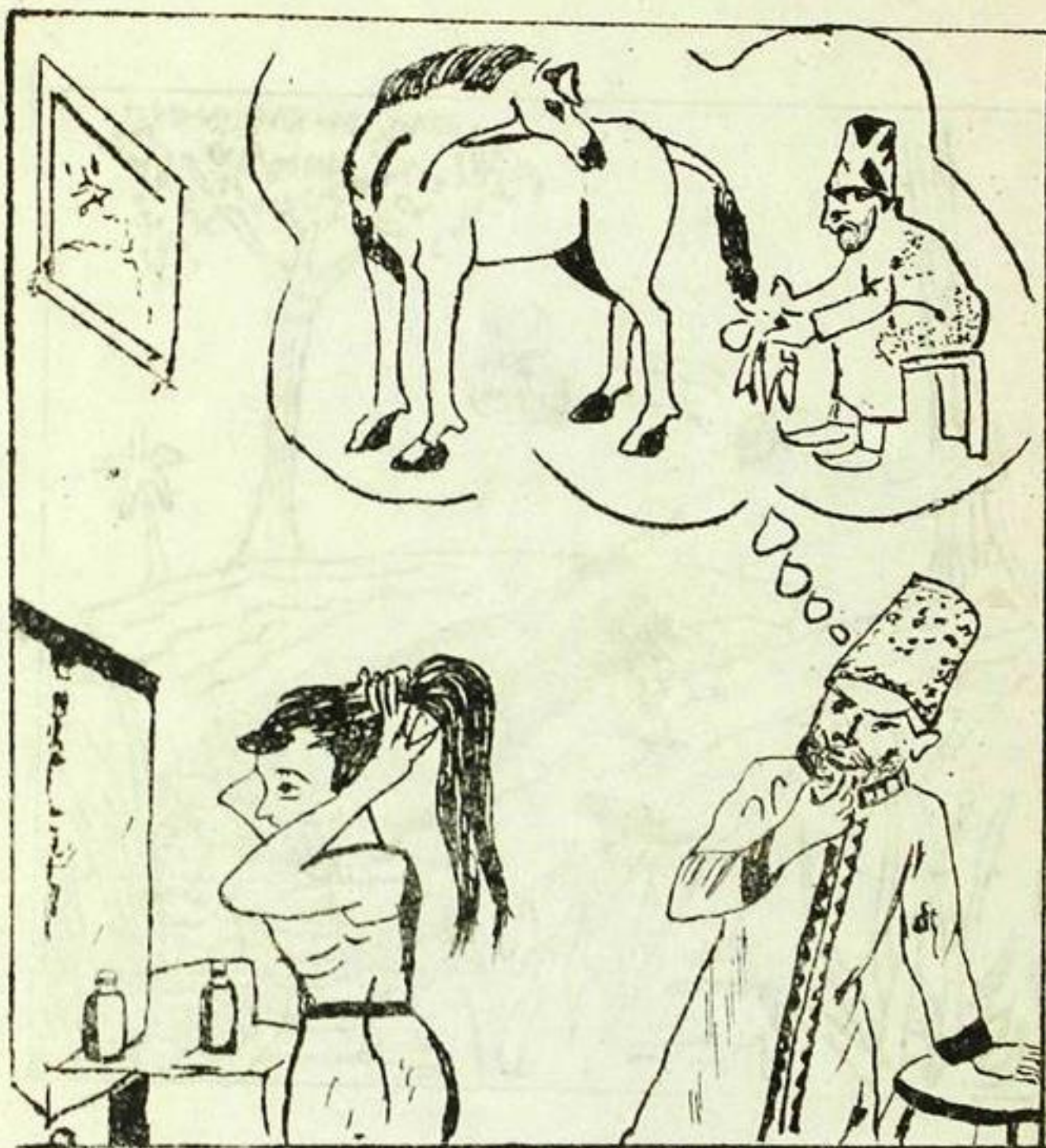
تو اور آرائش خم کاکل

میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

غالب

یاروں کا کام نکالنے کا یہ عمل بھی خاصہ دل چسپ ہے
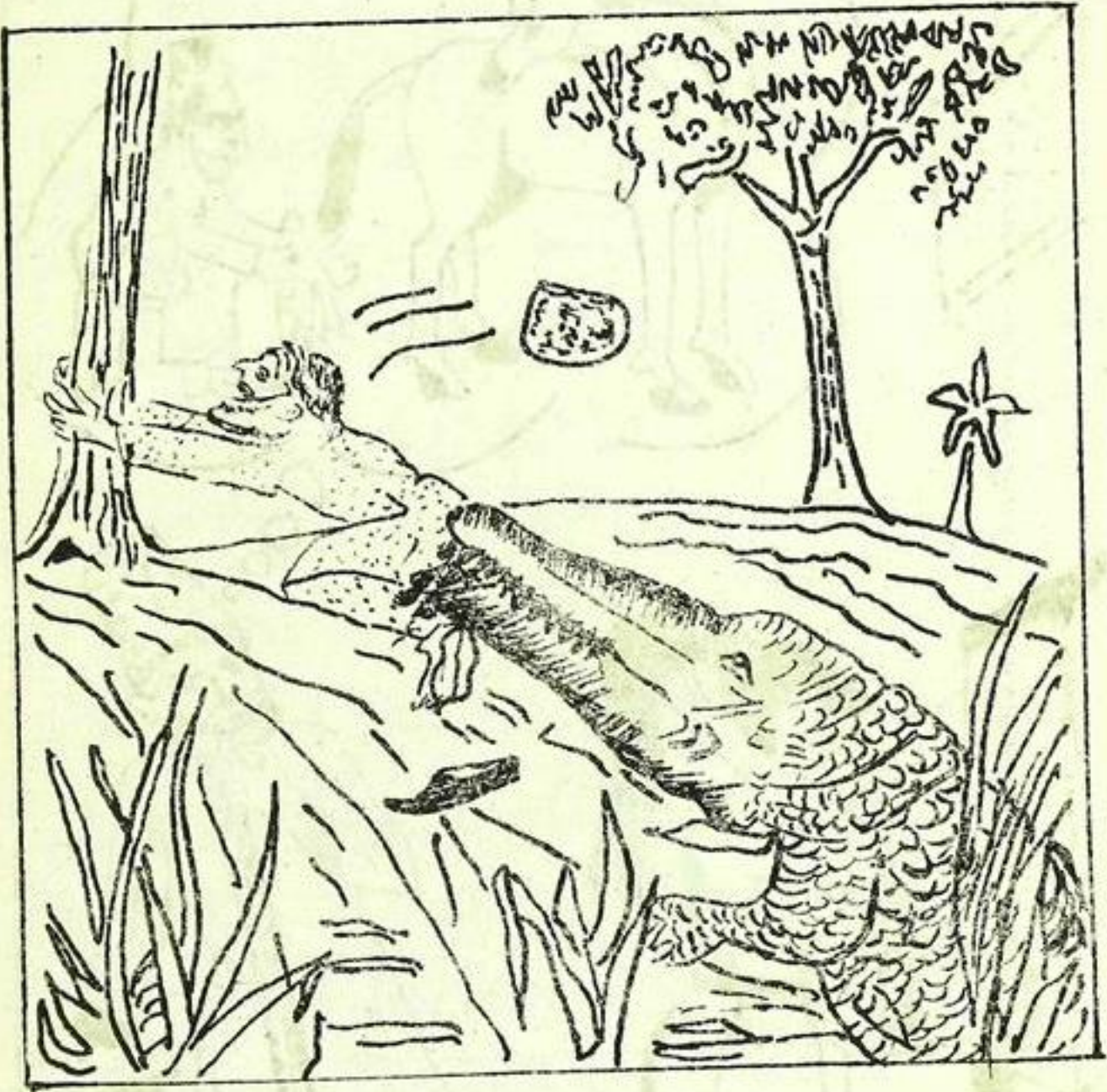
دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذت درد

کام یاروں کا بقدر لب و دنداں نکلا

غالبؔ

اس دلچسپ کارٹون میں
سب سے بڑی خوبی کیفیت کے اظہار کی ہے
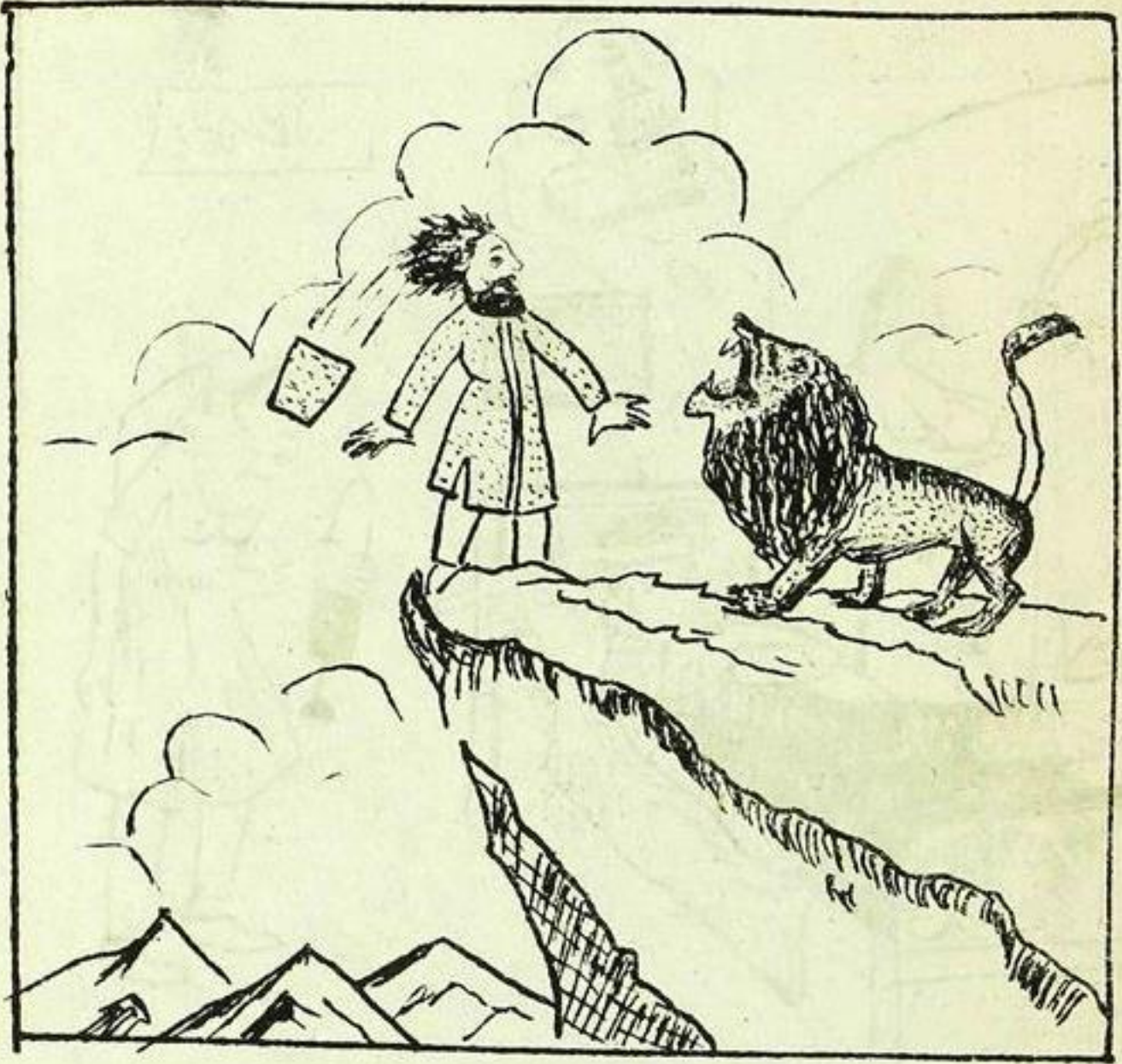
زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

غالبؔ

اس کا تو خود غالب نے اعتراف کیا تھا کہ "اب وہ کام کے آدمی" نہ رہے مگر تفصیلاً ہم تک اس رنگ میں نہ پہونچی تھیں مرزا کے "تصور عشق" پر یہ کارٹون وہاب حیدر کی جدت ہے اور خوب ہے۔

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

غالبؔ

مرزا کا سابقہ نشہ بندی کی روک تھام. والوں سے نہیں پڑا تھا
ورنہ تقریباً یہی صورت پیش آتی ۔

حالانکہ ہے یہ سیلی خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشہ پرمے کا گمان ہے

غالبؔ کے محبوب کے قد و قامت پر انکی یہ پھبتی بھی خوب ہی خوب ہے

سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر

تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آئے

غالبؔ

"راہ گذر" کی اس سے بہتر تعریف ممکن نہیں اسے دیکھ کر مرزا بھی بغیر مسکرائے نہ رہتے۔!
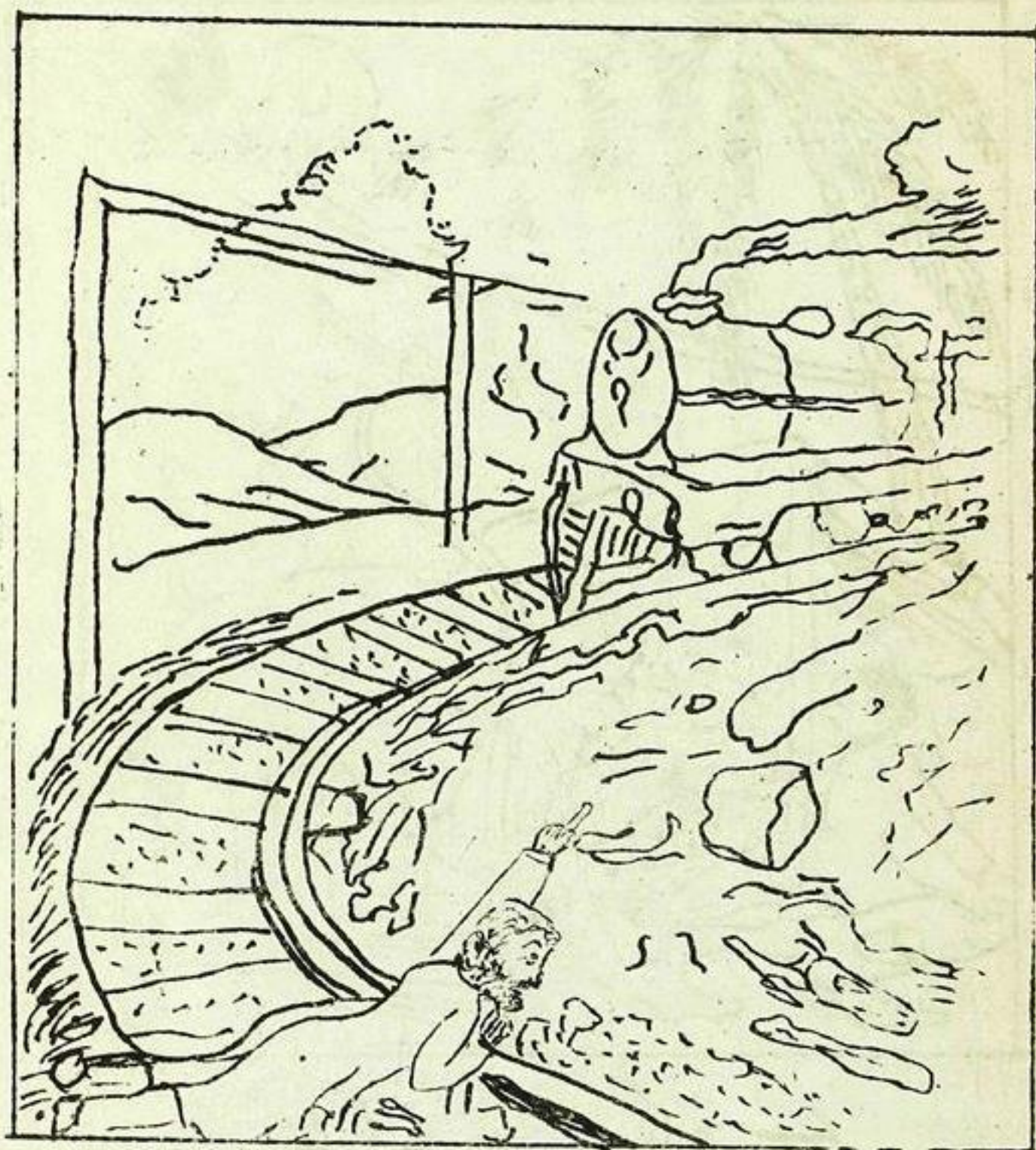
زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی ہے
کیوں ترا راہ گذر یاد آیا

غالب

"خدا کی قدرت،، کا مرزا نے بھی اعتراف کیا تھا مگر اس کا یہ پہلو شاید انکے ذہن میں بھی نہ ہو جو دہاب حیدر کو سوجھ گیا۔ ادر خوب سوجھا
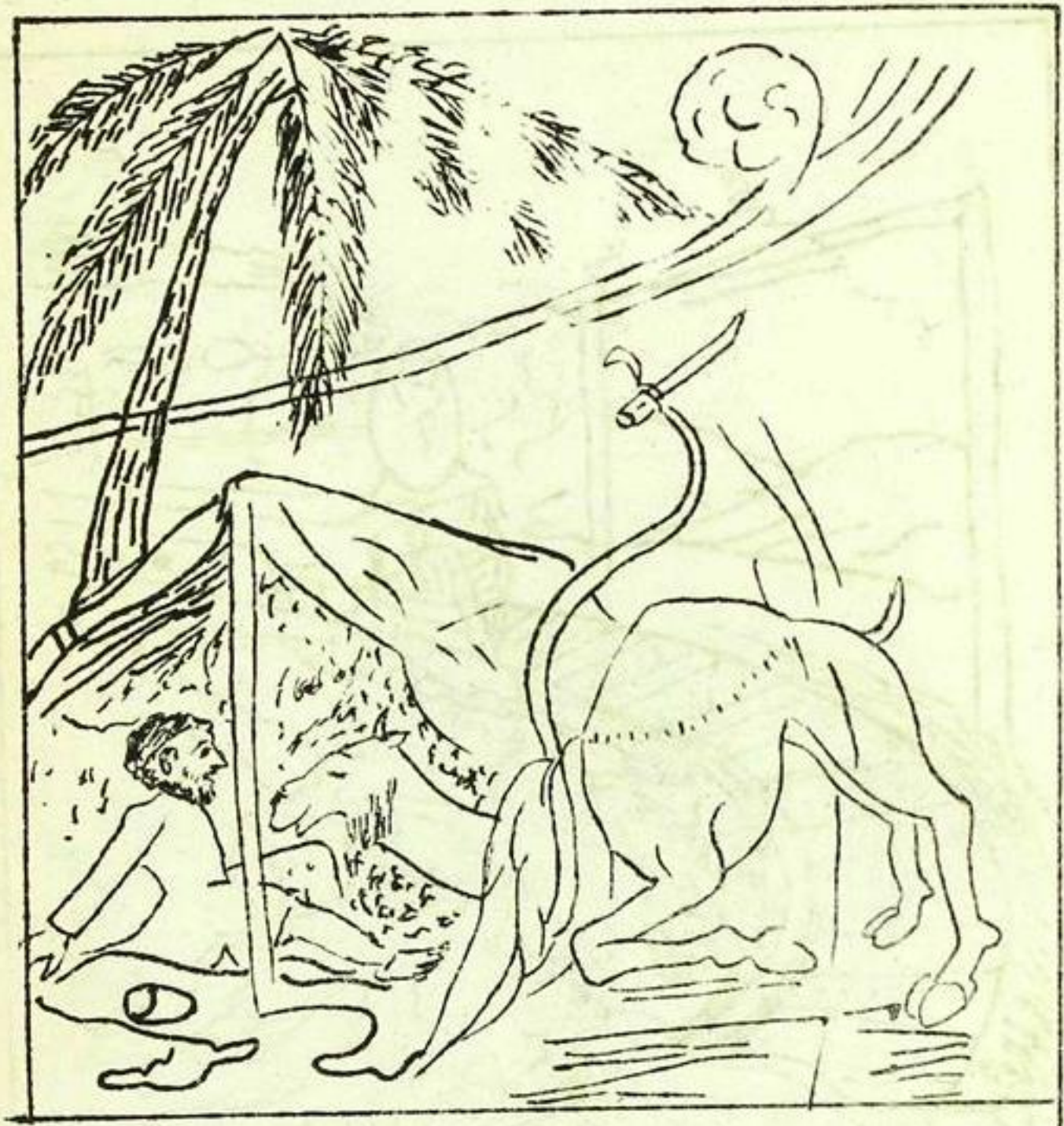
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

غالبؔ

وہاب حیدر کی تعریف یہ ہے کہ وہ تعریف کے وقت اس بات کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ کہ کارٹون شعر پہ پورے طور پر چسپاں ہو جائے۔ ،، نامہ کی طوالت ،، ،، اور عجلت ،، دونوں کو بنا کر انھوں نے مضحک پہلو کس چابکدستی سے ابھارا ہے۔

نہ دے نامہ کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے

کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا

غالبؔ

"شعور کی رو" دیکھئے مرزا کو "محشرِ خیال" بنائے ہوئے ہے اس کارٹون میں کافی "جدیدیت" معلوم ہوتی ہے؟ بس خرابی یہ ہے کہ کوئی خیال ادھورا یا مبہم نہیں ہے!
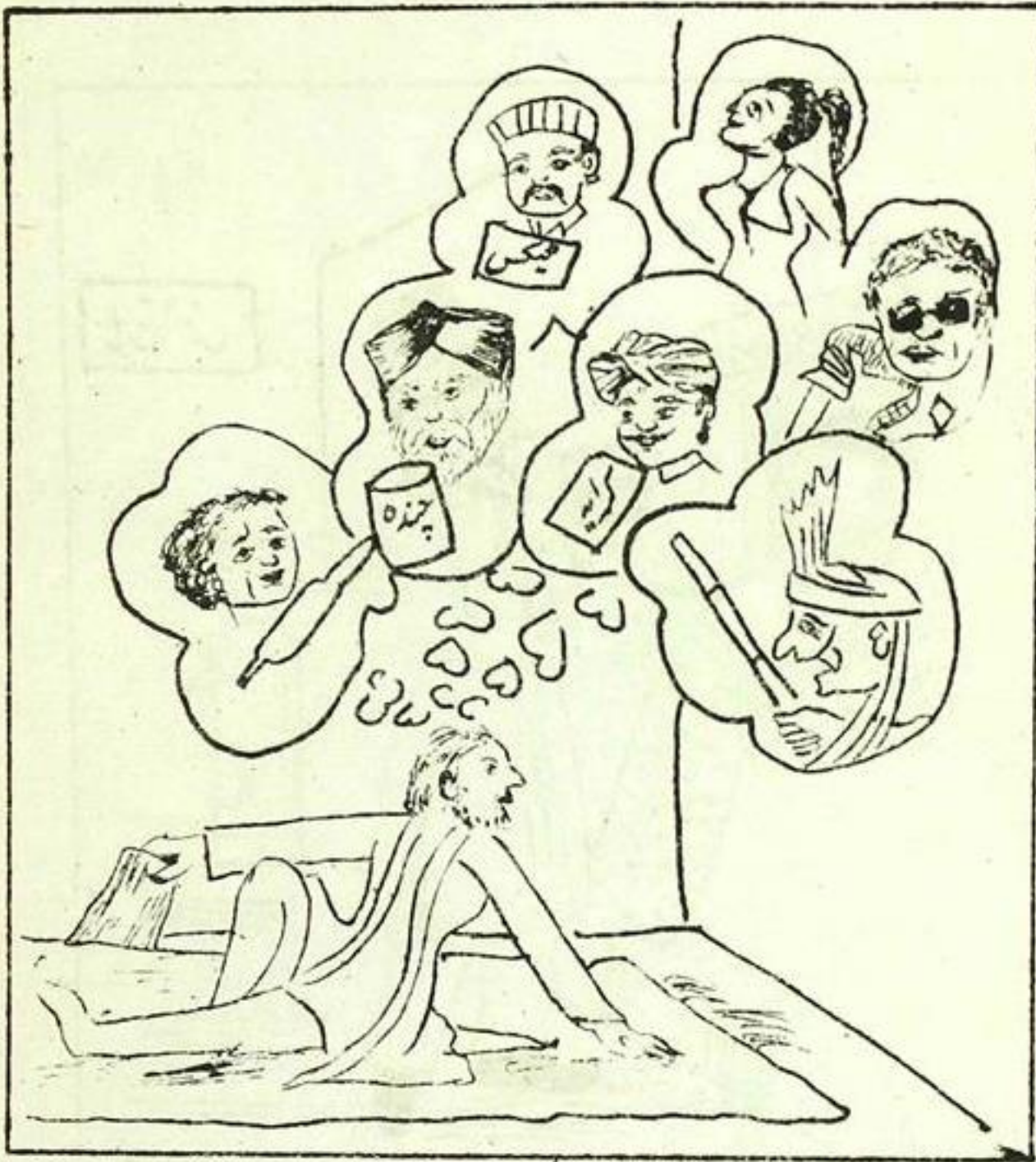
ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال

ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

غالب

نوحہ گر کو ساتھ رکھنے کی شاید اس سے بہتر اور بیساختہ توجیہہ ممکن نہیں
مرزا کی بغل میں جو کچھ ہے وہ اپنی وضاحت آپ ہے
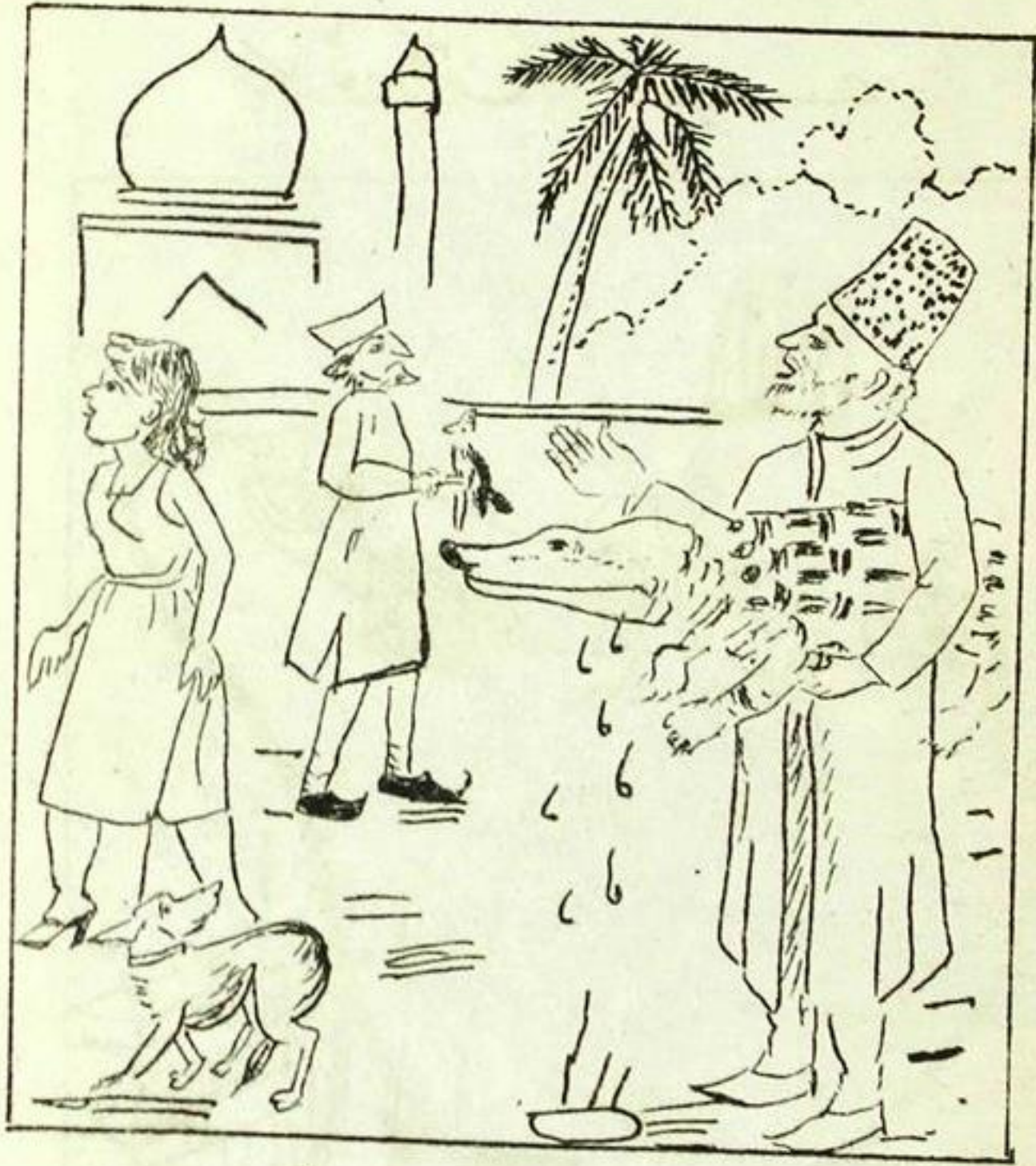
حیران ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

غالب

دیکھیے

یہ کارٹون کتنا دل چسپ ہے

اپنے دل ہی سے میں احوالِ گرفتاریِ دل
جب نہ پاؤں کوئی غمخوار، کہوں یا نہ کہوں

غالب

مرزا کا یہ شعر اسپوتنک ،، کے دور پر بھی کتنا صادق آتا ہے ۔ وہاب حیدر
ان کو ایسی جگہ لے آئے ہیں واقعی جہاں نہ کوئی ہم سخن ہے اور نہ ہم زباں
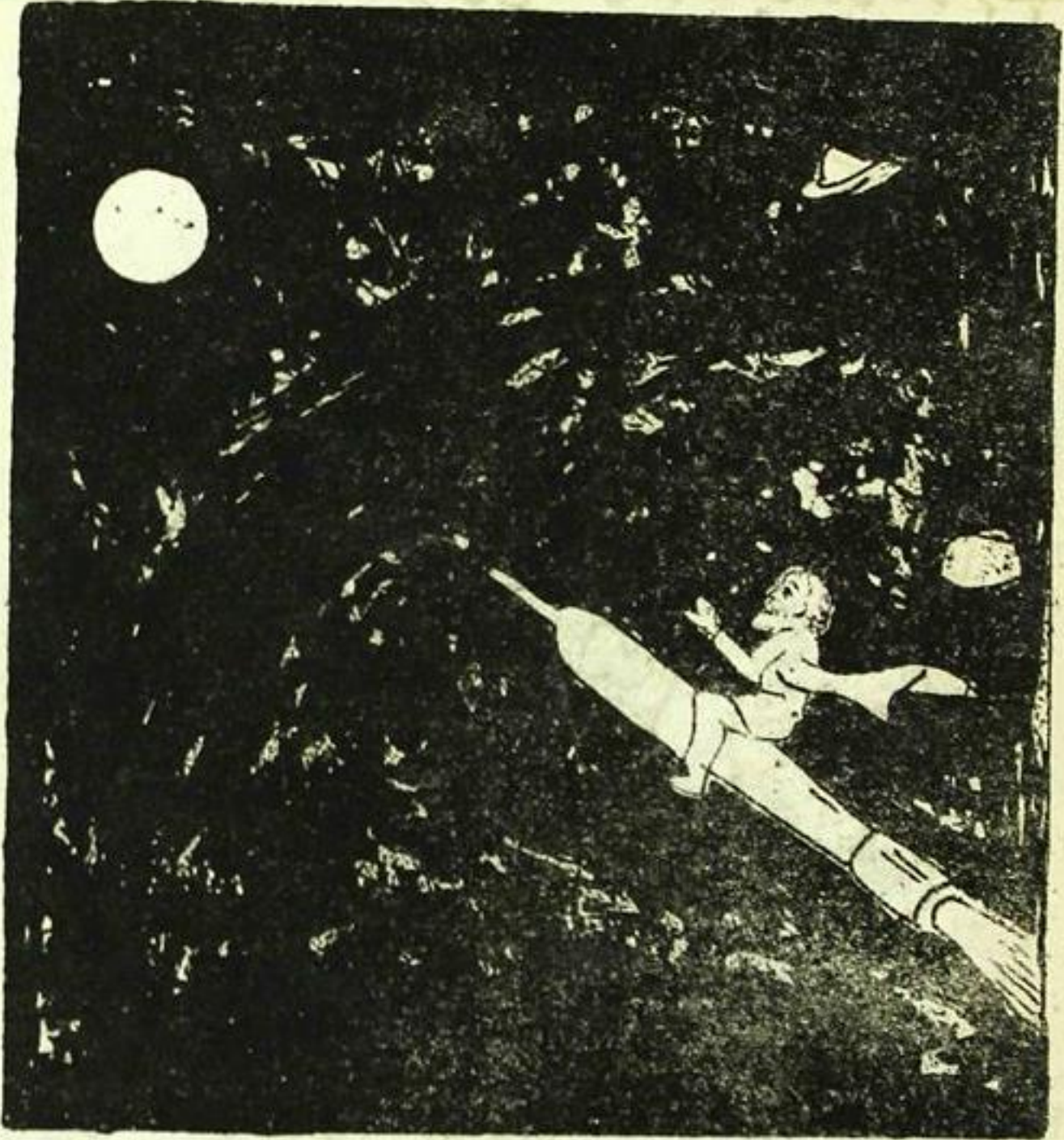
رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

غالب

یہ کارٹون کتنا دلچسپ اور خیال انگیز ہے

اتنے سنجیدہ شعر سے اتنا شگفتہ خیال پیدا کرنا وہاب حیدر ہی کا کام ہے
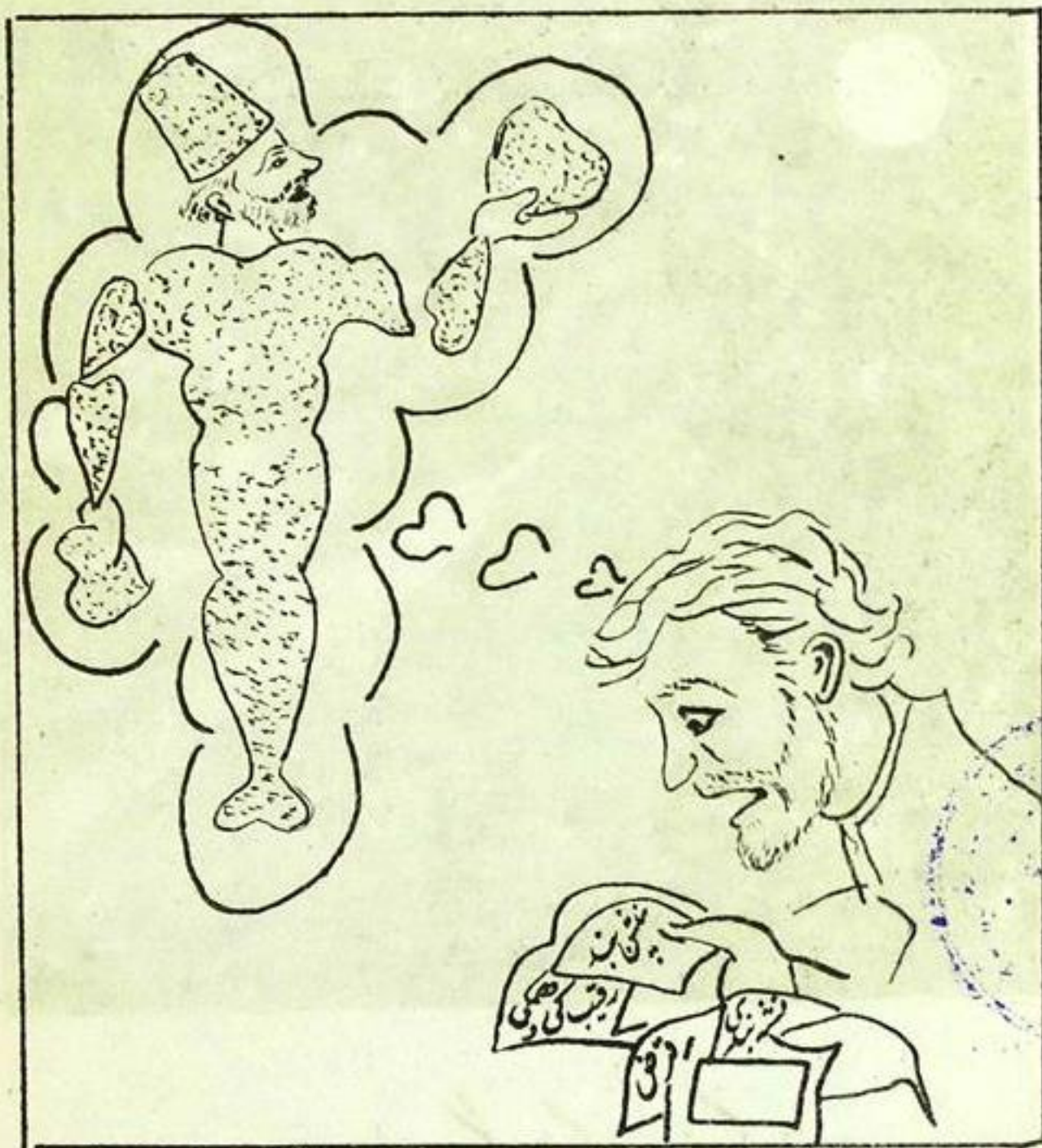
میری قسمت میں غم گر اتنا تھا

دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے

غالب

شعر پہ شوشہ :- وہاب حیدر عمل
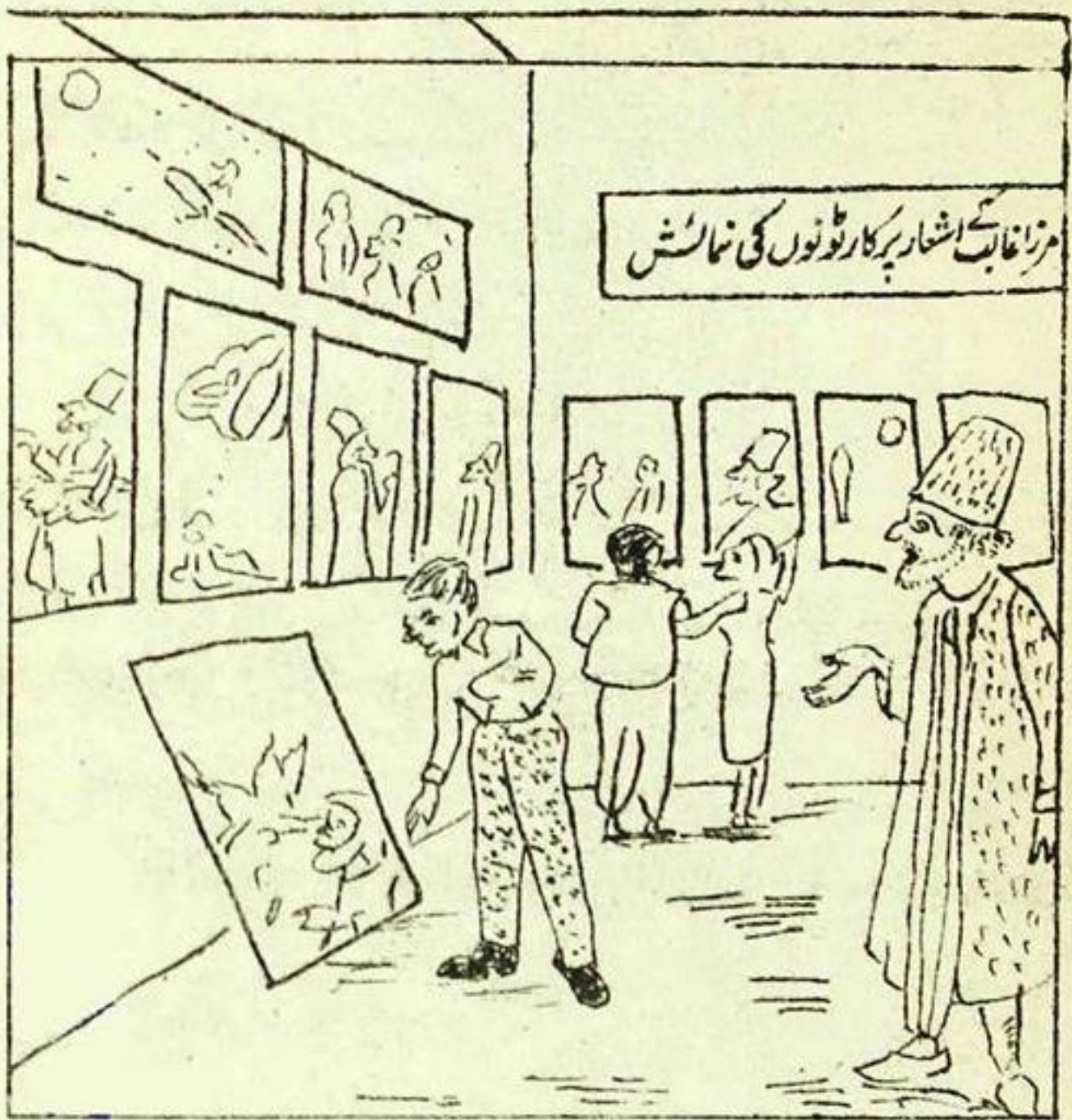
ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

مرزا غالب کے اشعار پر کارٹونوں کی اس نمائش میں وہاب حیدر کے یہاں انواع اقسام کے رنگا رنگ صلے ہا کارٹون ہیں جن میں "دل لگی" بھی ہے اور "عرضِ ہنر" بھی۔ وہاب حیدر کے یہ کارٹون اردو ادب اور غالبیت کے باب میں ایک دلچسپ اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں اسی وجہ وہاب حیدر غالب کے ایک ممتاز کارٹونسٹ کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے

منشی سجاد حسین کی ظرافت

منشی سجاد حسین کا شمار اردو ادب کے ان ظریفوں میں ہے جنھوں نے اردو ظرافت میں پہلی بار ادبی اقدار کو قربان کئے بغیر رمز، طنز، اور مزاح کے ذریعے سماجی اصلاح کے عناصر اپنی تحریر میں نمایاں کئے۔

اردو ظرافت جعفر زٹلی سے شروع ہو کر میاں جرکین پر دم توڑ چکی تھی اردو مزاح کی روایت کا سلسلہ دربار سے ملنے کی وجہ سے اس پر شخصی رنگ غالب تھا۔ ابتذال پھکڑ اور پھبتی کے نمونے زاہد، شیخ محتسب اور ناصح سے چھیڑ چھاڑ کی صورت میں بہت عام تھے۔ عام رنگ ظرافت ہجو، ہزل، ریختی، واسوخت، مثنوی اور شہر آشوب کی شکل میں ہجو، ملیح، پھکڑ پن ڈھول دھپے اور چھیڑ چھاڑ کے رنگ میں ڈوبا ہوا نظر آتا تھا۔ ظرافت کی یہ شخصی اور کثیف شکل تھی جس میں شائستگی اور متانت کا دخل بہت کم تھا۔ مجلسی زندگی کی مصنوعی اقدار اور کھوکھلی روایات کار، سبب سیاسی زوال، اور مادی کش مکش سے معاشرے اور تہذیب میں پیدا ہونے والی وہ نفسیاتی پیچیدگیاں تھیں جنھوں نے مزاجوں میں احساس کمتری عام کر دیا تھا۔ سودا سے شاہ نصیر تک شاعری میں مزاح کے جو عناصر ملتے ہیں وہ اسی مخصوص ذہنیت کی غمازی کرتے ہیں۔

اردو نثر میں ،،خطوط غالب،، فسانہ عجائب ،، باغ و بہار ،، مرزا ظاہر دار بیگ اور ابن الوقت کے مزاح کے نمونے پیش کئے جا چکے تھے مگر یہ خواص تک محدود تھے۔ عوام میں وہ ذہنی رو کار فرما تھی جو درباری اور مجلسی زندگی میں شخصی کھوکھلے قہقہوں، مبالغہ آمیز جملے بازیوں رعایت لفظی اور ضلع جگت سلے میں

پروان چڑھ رہی تھی اور جسے روسا، اور امراء کے دیوان خانوں میں مصاحبین کی ذہانت چمکا رہی تھی

یہی مزاح منشی سجاد حسین کو ورثہ میں ملا۔ مگر اس پر ان کی نفاست پسند طبیعت نے قناعت نہ کرتے ہوئے اپنی راہ سب سے الگ نکالی اور اپنی ذہانت سے انھوں نے مزاح کا رخ "شخصی" سے "اجتماعیت" کی جانب پھیر دیا اور اردو ادب اور صحافت میں پہلی بار اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور قومی مسائل کو ظرافت کے پردے میں بڑی متانت سے پیش کیا۔ افراد کے بجائے انھوں نے اقدار، مسائل اور موضوعات کو اپنا ہدف بنایا

منشی سجاد حسین نے جنوری ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے لندن "پنچ" کے طرز پر اودھ پنچ کا اجراء کیا جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اردو ظرافت پر انگریزی مزاح کے اثرات کا اسی سے آغاز ہوا۔

اودھ پنچ کے منظر عام پر آتے ہی فضا قہقہوں سے زعفران زار ہوگئی اس کے جلو میں طنز و مزاح کا سیلاب اور مسکراہٹوں کے انار تھے۔ اودھ پنچ ایک سنجیدہ مسلک کے ساتھ مزاحیہ رنگ میں نکلا۔ یہ کٹر کانگریسی اور قوم پرست اخبار تھا۔ اور اسکی پالیسی صلح کل تھی۔ یہ ہر مذہب و ملت کا نقیب تھا۔ اس کا فرض تمام ہندوستانیوں کے مسائل حل کرنا اور انکے لئے سینہ سپر ہوجانا تھا۔

اودھ پنچ کی حیثیت سنگ میل کی ہے۔ اودھ پنچ میں منشی سجاد حسین نے آزادی کی جنگ قلم سے لڑی۔ قدامت اور مغرب پرستی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور غلامی کی تن آسانی پر آزادی کی سخت کوشی کو ترجیح دی۔ ہر سیاسی معرکے میں اودھ پنچ نے ہمیشہ کانگریس اور ہندوستانی عوام کا بہت ڈٹ کر ساتھ دیا۔ "الحاق اودھ" "انکم ٹیکس" "البرٹ بل" اور انگریز کے کالے قانون وغیرہ

بر پریس ایکٹ کے باوجود منشی صاحب نے اودھ پنچ کے توپ خانے سے سخت گولہ باری کی۔ اسی کے ساتھ انھوں نے کورانہ تقلید اور زوال پذیر عناصر کا بھی خاکہ اڑا کر فضا میں اعتدال اور اعتماد بحال کرنے کی کوشش کی۔ وہ مشترکہ کلچر کی ترجمانی کے لئے ہولی، دیوالی، بسنت، اور شب برأت کے موقع پر پتنگ والے سرخ و زعفرانی کاغذ پر اودھ پنچ کے بڑے رنگین نمبر بھی نکالتے جن میں ساقی نامے اور ترانے ہوتے وہ سارے زمانے کو ساتھ لیکر چلنے کے قائل تھے۔

منشی سجاد حسین کا اودھ پنچ ایک مکتبہ فکر اور ایک ادبی و عوامی تحریک تھا جس کا مقصد قومی شعور بیدار کرنا، تہذیبی جنگ لڑنا سماجی ناہمواریوں پر بہت بیباکی سے طنز کرنا اور حق بات کہنا تھا۔

اردو ادب میں منشی سجاد حسین جدید مزاح کے بانی تھے انھوں نے پہلی بار ہمارے لئے مزاح کی زمین ہموار کی۔ اردو نثر میں مزاح کی ایک نئی روایت کی بنیاد رکھی۔ اور طنز و مزاح کو مہذب ظرافت میں شائستگی سے برت کے اس کا رخ تفنن سے افادیت کی جانب موڑ دیا۔ انھوں نے اجتماعیت میں انفرادیت کو نکھارا اور سیاسی، معاشی اور مذہبی مسائل کو گرفت میں لاکر بڑے سے بڑے معرکے سر کیئے۔

اودھ پنچ اور اس کے لکھنے والوں نے ادبی معرکے مثلاً حالیؔ، سرشارؔ، داغؔ اور نسیمؔ کے سلسلے میں جو انھوں نے سر کیئے۔ اصلاح زبان و بیان کے باب میں ہمیشہ انکی ایک اہمیت رہیگی۔

منشی سجاد حسین کی ظرافت کثرت پہلو رہی ہے وہ بیک وقت ایک اہم صحافی کامیاب کالم نویس، زبردست طنز و مزاح نگار اور بہترین ناول نگار تھے۔

"کھلا خط سربستہ مضامین"، "پیارے کارسپانڈنٹ کا پیار خط"، "نیچہ کا مارشل لا"

اور انڈے بچے والی چیل چلہار جیسے باغ و بہار مضامین اور سلسلۂ مضامین میں جہاں انھوں نے خالص لکھنؤ کی ٹکسالی زبان میں فصاحت، بلاغت اور شگفتگی کے دریا رواں کر دیے ہیں۔ وہاں لوکل اور موافقت زمانہ،، جیسے بہاریہ کالموں میں زمانے کی سیاسی اور تہذیبی رفتار پر جس انداز میں تبصرہ کرتے تھے وہ انھیں کا حصہ تھا پڑھنے والوں کو اس کا بڑی بےچینی سے انتظار رہا کرتا تھا۔

اودھ پنچ میں جب انھوں نے ناول نگاری شروع کی تو اردو ناول نگاری کی صبح صادق تھی۔ یہ داستان کے زوال اور ناول کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس کی ابتدا انھوں نے کایا پلٹ سے کی اور ایسی کہ بڑے بڑے کی کایا پلٹ دی۔ پھر "میٹھی چھری،، کے وہ ہاتھ دکھائے کہ دیکھنے والے مرغ بسمل ہی ہو گئے"۔ اس کے بعد "احمق الذی،، کو پیش کر کے روتوں کو ہنسا دیا۔

پھر "حاجی بغلول،، کو جرہ دکھا کر ہنستوں کو لوٹ پوٹ کر دیا اور پھر طرحدار لونڈی،، پیش کر دی طبیعت جو گدگدائی تو تخلیق کے بجائے ترجمے کے جوہر دکھلائے اور ایک انگریزی ناول کو طلسمی فانوس کے نام سے پیش کر دیا۔ ان کے ترجمے میں بھی تخلیق کی شان ہے۔ مانگے تانگے کا گمان بھی نہیں ہوتا۔

بامعنی اخبار نویسی کی طرح انھوں نے ناول نگاری بھی بامقصد ہی کی یہی مقصدیت اور معنویت انکے پلاٹ کو مربوط اور چوکس بنائے رہی۔ اسی وجہ سے انکے کردار ہنستے بولتے اور جاندار ہیں

دنیا اور زمانے پر گہری نظر کی وجہ سے انھیں بڑی دور دور کی سوجھتی ہے اسی کے ساتھ ساتھ ان کے ہر ناول میں فنی چابکدستی، ظرافت کا متوازن استعمال، سنجیدہ اور متین لہجہ، نادر تشبیہات، اچھوتے استعارے۔ اور لفظ لفظ اور سطر سطر میں شوخی، شگفتگی، ظرافت اور طراوت عجب بہار بے خزاں کا نقشہ پیش کرتی ہے۔

ان کا آرٹ کردار سازی اور مکالمہ نگاری کا ہے۔ یہ زبان و بیان کی نزاکتوں اور لطافتوں کے ماہر ہیں۔ بیگمات، انّا، لونڈی، ماما، آتو، مغلانی استانی، نواب، غلام، خادم، مصاحب سبھی کے انھوں نے بڑے جاندار اور منفرد کردار پیش کئے ہیں۔ یہ سب اپنے طبقوں کی نمائندگی میں بہت کامیاب ہیں۔ انکے انداز رہن سہن، گفتگو، فکر اور الجھنوں کو انکی گرد و پیش کی دنیا کے مطابق پیش کرنے میں منشی سجاد حسین بہت کامیاب ہیں لکھنؤ کے نوابوں کی عکاسی میں یہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اور "طرحدار لونڈی" میں ذرا انکا ایک حکم سنئے

"اسے طوطوں کی کوٹھری میں بند کر دو"

ذرا لونڈی کی طراری بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"دیکھو بھئی میں پکار کے کہے دیتی ہوں، جو میرا ذکر کسی نے کیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں، پیاز کے چھلکے اتار کر دھر دوں گی، ہنڈی کچھ منو ہی نہیں، میں بھی قسم اللہ کی ایسی ایسی سناؤں گی۔ تو پھر مدتوں تک داغ نہ چھوٹیں گے۔"

"احمق الذی" کا آغاز یوں ہوتا ہے

"رات کا جوڑا دیر سے کھل چکا، لمبے لمبے گیسوں کی بالچھڑ شبنم کے عرق میں خوب بھیگ چکی۔ کالے ناگوں نے جھک کر اوس چاٹ لی۔ چودھویں کا چاند پچھم کی طرف جھک گیا۔ قرص کافور کیطرح ہوا۔ ہوا چاہتا ہے.........

غرض صفحے صفحے الٹتے جائیے۔ شوخی اور شگفتگی میں ڈوبی متانت سے سرشار ظرافت یوں ہی رواں دواں ملے گی۔

بھولے نواب کے یہاں جشن ہو، یا اس سے ان کا ڈرامائی فرار . .
اس کا بھی منظر ملاحظہ فرمایئے

،،ماں کو سب تسلی دیتے تھے مگر ماں کی ماما متامیت نہ تھی جو دفن ہو سکتی ۔ صبر قرار بازار کی چیز نہ تھی کہ منگالیتیں، خیال آئینہ نہیں جو ہٹادیتیں،، داغ دل کا جل مٹی نہیں کہ بڑھادیتیں۔ خون دل ہنسدی نہیں جو چھڑادیتیں . . . .

یہ نثر نہیں شاعری ہے ۔یہی نثر ،،میٹھی چھری،، میں اپنے اوج کمال پر ہے ۔
سلطنتِ دہلی کے زوال اور عہد انگریزی کے عروج کا نقشہ جنرل مرچنٹ کی دوکان کی سازو سامان کے پردے میں پیش کیا ہے ۔ کہتے ہیں ۔

،، دوکان اس سرپرستی سے فاتح کے حوصلہ سے زیادہ بڑھ گئی پوری لین بھر کرایہ میں لے لی ۔

ایک طرف دواخانہ کھل گیا ۔شیشے قرابے بوتل شیشیاں الماریوں میں چنے ہیں یا حریف عارضہ کے مقابلے کو پلٹنیں آراستہ ہیں . . . . ،،

فرنگی رلیتہ دوائیوں کا کچھ نقشہ جس حسن وخوبی سے انھوں نے اس دوکان کے پردے میں کھینچا ہے ۔ اور اس میں جیسی نادر تشبیہیں اور استعارے اور اچھوتے خیالات پیش کئے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے ۔ مگر ان سب سے بھی بڑھ کر انکی ایک تخلیق ہے اور وہ ہے حاجی لغلول کا لازوال مزاحیہ کردار ،، حاجی کے احساس عظمت اور معزز انسان کی حیثیت سے زندہ رہنے کی خواہش، ہنسنے ہنسانے کا سامان فراہم کرتی ہے ۔ حد درجہ خود اعتمادی، ورقابلیت کا خناس ان کے لئے ہر روز ایک نئی مصیبت کا پیش خیمہ بن جاتا ہے ۔ خواہ گھوڑا بیچیں، عشق لڑائیں، اخبار نکالیں، یا اسپیچ دیں ہر موقع پر اور ہر جگہ زمانہ انکی ٹانگ کھینچ لیتا ہے اور یہ چاروں شانے چت نظر آتے ہیں نیلامی گھوڑا جو خریدنے کے بعد شوئی تقدیر سے گھوڑی نکلی ۔

اس پر انکی شہ سواری کی ایک جھلک آپ بھی دیکھئے

،، سائیس تو آپ جانئے ایک ہی پاجی ۔ ع

سر پہ شیطان کے اک اور بھی شیطان چڑھا ۔

اس نے بلا اجازت ایک طرف سے تنگ کا بکسوا کھول ڈالا اور دوسری طرف حاجی صاحب رکاب پر پاؤں رکھتے جریب وعبا کے ساتھ اچکے ہی تھے کہ کاٹھی شریک اس طرح کھسک کر گرے جس طرح . . . . درخت سے بندر . . . .

عمامہ مقدس تو بڑے کی صورت جانور کے روبرو پہنچا ۔ جریب زیتونی عبا میں ملفوف کشتی شکستہ کا مستول بنی ۔ اور یہ آشنائے بحر شہ سواری چاروں شانے چت کاٹھی کو صبر کی بھاری سل کی طرح سینے پر رکھے الٹے کچھوے کی صورت ہوا میں ہاتھ پاؤں مارنے لگے ،،

غرض اس سلیس بشستہ اور شگفتہ اردوئے مصلیٰ سے حاجی بغلول آراستہ و پیراستہ ہے اور انکی دوسری تحریروں کی طرح اس میں بھی انکی متین اور بامقصد ظرافت ہر اعتبار سے مثالی، تکسالی اور معیاری ہے ۔

صاحب ،،صدق،، کا نثری اسلوب اور طنز

مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی اردو نثر کا شمار ہمارے بیش قیمت کلاسیکی سرمایہ میں ہے ۔ جو کمیاب بھی ہے اور نایاب بھی ۔ کمیاب اس اعتبار سے کہ ہمارے نثری سرمایہ کی اساس جن صاحب طرز انشاپردازوں پر ہے ان کی تعداد ان گنت اہل قلم میں گنتی کی ہے ۔ اور تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے رجب علی بیگ سرور ، سر سید احمد خاں ، مولوی محمد حسین آزاد ، ڈپٹی نذیر احمد مولانا الطاف حسین حالی ، مولینا شبلی نعمانی ، سید سلیمان ندوی ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ، مولینا ابوالاعلی مودودی ، مہدی افادی ۔ مولینا ابوالکلام آزاد ، رشید احمد صدیقی ، کلیم الدین احمد ، ڈاکٹر سید عبداللہ ، آل احمد سرور ، ڈاکٹر وحید قریشی ، ڈاکٹر اختر احمد اورینوی ، ڈاکٹر سید محمد حسنین ، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی ، محمد طفیل ، ڈاکٹر وزیر آغا مشتاق احمد یوسفی ، کرنل محمد خاں ، اور انتظار حسین تک ہماری اعلیٰ ترین نثری روایت کا نچوڑ مولینا شبلی نعمانی سے انتظار حسین تک مولانا عبدالماجد دریاآبادی نظر آتے ہیں ۔ بقیہ اہم نثر نگاروں کو اس فہرست میں اس لئے شامل نہیں کیا گیا ہے کہ وہ ان اہم ادبی نثری ستونوں میں سے کسی نہ کسی کے سائے تلے نظر آتے ہیں یا اپنی راہ الگ نہیں بنا پائے ہیں ۔ شاید اس فہرست میں بھی مزید اختصار دو ایک ناموں کی حد تک ممکن ہو

مولینا عبدالماجد دریاآبادی کے یہ نثری کارنامے نایاب اور معتبر ہیں نایاب اس اعتبار سے کہ گذشتہ نصف صدی سے زائد کی مولانا عبدالماجد دریاآبادی کی ادھر ادھر کتب و رسائل میں منتشر ،،سچ،، اور ،،صدق،، میں محفوظ نثر عالیہ کو ابھی تک

یکجا اور محفوظ نہیں کیا گیا ہے ،، مقالات ماجد ،، انشائے ماجد ،، نشریات ماجد ،،
اور انکی متعدد دیگر تصانیف میں محض انکا عطر پیش کیا گیا ہے ۔ ورنہ انکی بیشتر عالمانہ
فلسفیانہ ادبی اور ہلکی پھلکی شوخ و شنگ تحریریں نہ ابھی تک انتخاب کی گئی ہیں اور
نہ یکجا ۔

صاحب صدق بیباک ترجمان ہیں ۔ اکبر الہ آبادی ، مولٰینا شبلی ، اور علامہ
اقبال کی اس عظیم روایت کا تسلسل انھوں نے نہ صرف برابر قائم رکھا بلکہ اسے
آگے بھی بڑھایا ہے ۔ انکے یہاں ملت کا گہرا درد ہے ۔ جس نے انکے قلم کو بے
لاگ ، نڈر ، اور باغی بنا دیا ہے ۔ حریت فکر ان کے یہاں سرفروشی کی حد تک ہے ۔ وہ
ایک انتہائی جری اور بے باک ادیب اور صحافی ہیں ۔

انکے ایک ناقد نے لکھا ہے کہ ان کے طنز میں خشونت ہے ۔ شاید کسی بھی
طنز نگار کو اس سے زیادہ خراج تحسین نہیں پیش کیا جا سکتا ۔ خشونت دراکی اور
بے باکی کی وہ منزل ہے جو طنز نگار کو پوپ اور سوئفٹ بناتی ہے خشونت کی نمو
حریت فکر سے ہوتی ہے ۔ جو ہمارے ادب میں انکے علاوہ تقریباً نہ ہونے کے
برابر ہے ۔ اس میخانے کے ساقی اور میخوار سب مصلحت وقت کے اسیر ہیں اور
تقریباً سبھی بادۂ خود غرضانہ ہیما سرشار اور مدہوش نظر آتے ہیں نفسی نفسی کی اس
تاریک فضا میں کبھی کبھار حق گوئی کے کوندے میں لپک جاتے ہیں جن کی روشنی میں
مثلاً تحلی مہدی ، اعجاز صدیقی ، ڈاکٹر آصف قدوائی ، رضوان احمد اور ڈاکٹر نثار احمد فاروقی
اردو یا دوسرے اقلیتی حقوق کے لئے بلا کسی طمع کے صدائے احتجاج بلند کرتے نظر
آجاتے ہیں ۔ ورنہ مطلع ادب وصحافت پر ،، صدق ،، کی احتجاجی بجلیاں ہی چمکتی رہتی
ہیں ۔

صاحب ،، صدق ،، کا نثری اسلوب موضوع کے عین مطابق ہوتا ہے ۔

اپنی مذہبی، دینی تحریروں اور تفسیر القرآن میں ان کا انداز عالمانہ، دقیق اور پُرشکوہ ہوتا ہے لیکن سادگی اور سلاست کے ساتھ۔ عالمانہ، فلسفیانہ اور تحقیقی مضامین میں ایک عالم ایک فلسفی یا ایک محقق کی شانِ تصنیف وہ برقرار رکھتے ہیں۔ اپنی ادبی اور صحافتی تحریروں میں وہ سادگی اور سلاست سے کام لیتے ہیں۔ ان کے نپے، تلے، اچھے چھوٹے چھوٹے جملے، برجستہ فقرے محاورے، اشعار اور مصرعے، تراکیب بولتے ہوئے رواں دواں الفاظ۔ پھر الفاظ بھی کیسے کہ جو لفظ بھی جہاں رکھ دیا ہٹائے نہیں ہٹ سکتا۔ انگشتری میں نگینہ کی طرح اپنی جگہ چمکتا ہے۔ ان کی نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عبارت چست اور متحرک ہوتی ہے۔ جامد اور بے جان نثر، ڈھیلی ڈھالی اور پھیکی تحریر کا اس بستان ادب میں گذر نہیں۔ یہاں شوخی و تازگی ہے تراوٹ اور جدّت ہے۔ ندرت اور ایجاز ہے، طباعی اور حکیمانہ اُپج ہے۔ سُرخی ایسی جمائی جاتی ہے کہ طبیعت پھڑک اُٹھے، چٹکی ایسی ہوتی ہے کہ بے اختیار تڑپنے والے کے منھ سے واہ! واہ! سبحان اللہ نکل جائے۔ اظہارِ مدعا میں ایسے بے باک اور منھ پھٹ کے دوسرا جو دل میں سوچتے ڈرے وہ ان کی خنجر قلم کی نوک پر دھری رہتی ہے۔ "ترکوں کی فوج" سے ڈرنے کا سوال نہیں مگر یہ تو آجکل "بیگم کی نوج" سے بھی نہیں ڈرتے۔ اس نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ نثر نگار کے پیچھے ہاتھ باندھ کر چلتی ہے۔ یہ جدھر اور جیسے چاہے اسے موڑ دیتے ہیں۔ اس نثر میں شگفتگی اور شادابی ہے۔ بشاشت اور خوش فکری ہے۔ سادگی اور روانی ہے۔ یہ نثر دل میں جاکر بیٹھ جاتی ہے، یا اس کے دھماکے دل اور دماغ میں محسوس ہوتے ہیں۔ اس میں کسک، اثر اور دھمک ہے۔ یہ بالکل ان کے ہاتھ میں ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والے کو جہاں چاہیں خوش یا اداس کردیں یا سوچنے اور سر دھننے پر مجبور کردیں۔ ان کا لہجہ ان کے موضوع پر منحصر ہے۔ اگر تحریر ادبی ہے تو لہجہ انتہائی شیریں، سبک اور ادبی ہوتا ہے۔ لیکن اگر تحریر صحافتی ہے۔ تو پھر اس میں لہجہ احتجاجی، بلند اور شوخ ہوتا ہے۔ لہجے میں طنز اور طرازی ہوتی ہے۔ یا محاسبے والا انداز ہوتا ہے۔ عام طور پر ان کا لہجہ بلند بانگ، پُرشکوہ

یا پھر یاسیت اور کرب میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اس لہجے میں درد و الم اور فکر جنوں کی آمیزش ہوتی ہے۔

صاحبِ "صدق" کے ادبی مضامین کا دائرہ بہت وسیع ہے اور جملہ نثری اصناف اپنے پورے علمی اور ادبی طمطراق کے ساتھ "سچی باتیں" کے کالم یا شذرات کے تحت نظر آتی ہیں، یہ مضامین مذہبی، تحقیقی، فلسفیانہ علمی یا ادبی ہوتے ہیں۔ ان میں طنزیے، مرقعے، انشائیے، خاکے، آپ بیتی، سفر پارے، تقاریر، معاشرتی جھلکیاں، منظرکشی تراجم اور تبصرے وغیرہ ہوتے ہیں۔

صاحبِ "صدق" کے عنوانات دیکھئے کیسے بولتے ہوئے ہیں:۔

"سچی باتیں" "خوشامدیوں کے نرغے میں" "اندرا سبھا کی ایک جھلک" "فتح سنگھ کی فتح" "کاغذی سیکولرزم" "قانون کی دھجیاں" "تعصب کی یلغار" "اگو بھگتوں سے" "جدت کی ندامت" "بلندیوں کی پستیاں" "عزت مآب سے تمسخر" "بے غیرتی کی منطق" "نظامِ خوش انجام" "چھاگلاازم" "بیجا بندشیں" "بچکانہ منطق" "در مدح خود می گوید" "ایک سادہ چک" "حکومت قہری" "بزدل سورما" "منصب کا جرمانہ" "ایسے ویسے کیسے ہوگئے" "خیر سگالی سے لگے ہاتھوں حج تک" "مہا خوشامد" "تیز مرچ کی چاٹ" "ناگفتنی پر گفتگو" "ہوا کے رُخ پر" "پرسنل لا پر عقبی حملہ" "دیر ہے اندھیر نہیں" "دیر و حرم کی یکجائی" "جہاں بات بنائے نہ بنے" "پُرانے ذاتِ شریف" "روشن خیالوں کی ہٹ" "پہاڑ کھودنے کے بعد" "بڑوں کی ہاتھا پائی" "بے خبری کا ریکارڈ" "شکاری اپنے ہی جال میں" "بھیڑیئے پاسبان کے روپ میں" "شرفائے شہر کی ڈھیلے بازی"

صاحبِ "صدق" "عُریانیت، اردو دشمنی، مسلم بیزاری۔ مذہبی مقامات کی بے حرمتی، منافقت۔ سائنسی استحصال۔ تہذیب سے عاری فلموں۔ مہا تما گاندھی کی تعلیما

سے بے اعتنائی۔ مغربی ریشہ دوانیوں، ممالک اسلامیہ کی بے عملی۔ بے دینی۔ فرقہ واریت۔ تخریب کاری۔ خوشامد۔ اربابِ نشاط۔ جنسی بے راہ روی۔ فرقہ وارانہ فسادات، فرقہ پرست تنگ نظر جماعتوں، اسراف بے جا۔ جدید جرائم۔ کاغذی سیکولرزم ماضی سے بے تعلقی، اردو فارسی اور عربی تعلیم سے بے پروائی۔ مسلم اداروں پر تعصب کی یلغار۔ قانون کی بے حرمتی اور بے دینی کے خلاف ایک مسلسل، احتجاج ہیں۔

صاحبِ "صدق" کا اصلی رنگ مذہبی ہے یہ رنگ ان پر کھپتا بھی ہے اور کھلتا بھی ہے۔ "بے گانگیٔ مذہب"، "مسلم پرسنل لا"، "ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں" "رنگین جھوٹ وہ ہے تو یہ ہے سفید جھوٹ"! "بلا تبصرہ" "گائے جیسے گلزاری لال" "کچھ جنوں میں ابھی آمیزشِ دانائی ہے"، "ایں گل دیگر شگفت"، "ایک خوشخبری جو خوشخبری نہیں"، "اپنا چہرہ اپنے آئینے میں"، "محمود و ایاز ایک صف میں"، "ایک سادہ چک"، "ایک بے وقار قوم"، "خیر سگالی سے حج تک"، "بیک گردشِ چرخ نیلوفری" "نئی سپر"، "ایک حادثۂ ملی" "پھر وہی نیش زنی" اور "تعصب کی رو میں" اس کی روشن مثالیں ہیں۔ "سچی باتیں" میں یہ رنگ بھی ملاحظہ فرمایئے:۔

"واعظِ دین کی ذمہ داری یوں بھی بڑی ہوتی ہے۔ دین کے نام سے زبان بہت سوچ سمجھ کر اور اپنے بول کو تول کر، کھولنا چاہیئے۔ چہ جائیکہ جب وہ بیان حرم کعبہ میں ہو رہا ہو۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خدائے پاک کی قسم کھا کر ہو رہا ہو۔ اگر ایک ہندوستانی عالم نے ایک دوسرے ہندوستانی عالم کو مدینہ منورہ میں یہ ارشاد فرماتے سنا کہ "ٹیکا لگوانا بہت برا کام ہے اس لئے کہ یہ توکل کے منافی ہے۔" اس پر صاحبِ "صدق" فرماتے ہیں) ...... اور اگر علاج ہی ہر صورت میں ناجائز ہے تو پھر اس دنیا میں اسباب سے تمسک و توسل اور تدبیر سے کسی شعبۂ زندگی

میں بھی کام لینا کس طرح جائز ٹھہرے گا۔ ؟ — کیا مصیبت ہے۔ کہ جہاں ایک طرف ہر جدید چیز لذیذ ہے۔ عزیز ہے۔ ممدوح ہے۔ اندھا دھندلے لینے بلکہ اُچک لینے کے قابل ہے وہاں دوسری طرف ہر جدید چیز مردود ہے۔ اچھوت ہے۔ بچنے اور وحشت کھانے کے قابل ہے۔ اور دینداری مرادف ہے۔ قدامت پرستی کے۔!"

(صدق جدید ۲۷ جنوری ۱۹۶۷ء ص ۱، ۲)

صاحبِ "صدق" کی وسعتِ نظر اور وقتِ نظر کی ایک جھلک ان کے تحقیقی مضمون "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام - جدید اڈیشن۔" میں ملاحظہ ہو:۔

"...... جہاں تک کوشش و کاوش ...... تلاش و تفحص کا تعلق ہے مغربیوں کے یہ کارنامے ہمارے لئے قابلِ رشک ہیں۔ معلومات کن کن گوشوں سے اور کہاں کہاں سے لے آتے ہیں، کہ ہم مشرقیوں کا تو ذہن بھی وہاں تک نہیں پہونچتا۔ اور ان کے یہاں کے سے نادر کتب خانے ہماری دسترس میں کہاں ہیں۔ مصیبت اور شامت یہ ہے کہ چونکہ ان کی تخلیقادت کی بنیاد کج ہے۔ اس لئے نتائج کی دیوار سر بہ فلک کھڑی کرتے ہیں تو وہ ٹیڑھی ہی چلی جاتی ہے اور عقائد اور تمدن اور جزئیات سیرت نبوی سے متعلق یہ کجی اتنی شدت سے نمایاں ہو جاتی ہے کہ ان کی تحقیقات کا پڑھنا ہی صبر آزما ہو جاتا ہے۔"

(صدق جدید ۲ دسمبر ۱۹۶۶ء ص ۵ کالم ۱)

صاحبِ "صدق" کے فلسفیانہ مضامین کی ایک جھلک "تخلیق کا سدا بہار کاروبار" میں ملاحظہ فرمایئے:۔

"کائنات پھیل رہی ہے اور وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔ ستارے ہم سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔" کائنات کسی انجانی منزل کی طرف بڑھتی جا رہی ہے۔ بڑے بڑے سائنسی مضمون اور مقالے آجکل اسی قسم کے فقرے بھرے ہوئے دکھائی دیئے بلکہ کسی کسی مقالے کی تو سرخیاں بھی ایسی پائی گئیں۔ گویا سائنسی دنیا کے لئے

یہ کوئی اہم اور نئے انکشاف ہیں! خیر وہ سائنسی دنیا کے لئے جو کچھ بھی ہوں۔ مذہبی دنیا کے لئے تو یہ کھلی ہوئی اور بیش پا افتادہ حقیقتیں ہیں۔ خالقِ کائنات کی قوتِ تخلیق جب معطل نہیں ہوئی ہے، تو آخر جس طرح چرند و پرند ہر قسم کے جانور اور شجر و حجر ہر طرح کے نباتات و جمادات ہر روز نئے نئے وجود میں آتے رہتے ہیں۔ تو کیا وجہ ہے کہ نئے نئے ستارے اور چاند اور سورج نہ پیدا ہوتے رہیں؟ آسمانوں اور کہکشانوں کی آفرینش کیا اب بند ہوگئی ہے؟ آخر یہ فرض ہی کیسے کر لیا گیا؟ کلّ یوم ہو فی شان میں کیا کوئی استثنا بھی ہے۔"

(صدق جدید ۱۳ر اکتوبر ۱۹۶۷ء ص ۲ کالم ۱)

صاحبِ "صدق" سرتاپا علم ہیں ان کے علمی مضامین کی سچ پوچھیے تو اک زمانے میں دھوم ہے۔ ان کی بھی ایک جھلک ملاحظہ ہو:-

"...... تاریخ طب یونانی۔ اس میں تفصیل کے ساتھ دکھایا جائے کہ فن کی ابتدا کس ملک سے کس زمانے میں ہوئی۔ دنیا میں اور کون سی طبیں اسوقت رائج تھیں یا نام طب یونانی کیوں ہوا؟ اور کب سے پڑا؟ بانی، امام، مجدد، مجتہد کون کون سے گذرے ہیں؟ ترمیم، ترقی تکمیل کے مدارج کیوں کر طے ہوتے رہے ہیں یا موجودہ دور میں فن کس منزل پر ہے وغیرہا اور اسے اس کے موجودہ مرتبہ تک پہونچانے میں کتنا بڑا حصہ اطبارِ ہند کا رہا ہے۔"

(تاریخ اطبارِ ہند۔ صدق جدید ۱۳ر جنوری ۱۹۶۷ء ص ۵ کالم ۱)

صاحبِ صدق کی ادبی تحریروں میں بڑا رچاؤ اور اسلوب کا بانکپن ہوتا ہے۔ ان کی انشا کے چٹخاروں کا اگر مزا لینا ہو تو "علیگڈھ مرحوم"، "ایک آرٹسٹ" "ایک پرانی خانقاہ"، "ہڑتالیں"، "دو دن بھوپال میں"، "یہ نانیاں دا دیاں"، "پرانی چشمک"، "دورِ الہلال کے مولانا ابوالکلام"، "جدت کی قدامت"، "بحرہ مردار"

"نظام خوش انجام"، "عمر کا پچھترواں سال"، "قصبہ گدیہ"، "گڈ فرائڈے"، "موسم سرکاری تقریب میں"، "مسلمان صدر جمہوریہ"، "انسان کی بے بضاعتی"، "اثر لکھنوی مرحوم" "جوش و ساقی"، "سید حسین مرحوم کی ایک یاد"، "اقبال کا شکوہ"، "خاندانی قبرستان" "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس"، "احمد غریب مرحوم"، "ریل کا سفر"، "راجے مہاراجے"، "نئی دنیا والے"، "عظیم باپ اسٹالن"، "تخلیق کا سدا بہار کاروبار"، "کنکوے کا مقابلہ"، "تقریر بے تاثیر"، اور دوسری سچی باتوں اور ان کے دیگر شذرات کا مطالعہ کرے۔ ایک نمونہ "چند گھنٹے علیگڈھ میں" دیکھئے:۔

"سرور صاحب (صدر شعبۂ اُردو) کا ساتھ سفر میں لکھنؤ ہی سے ہو گیا تھا اور کہنے والے کی زبان پر اس وقت آ گیا تھا کہ —"جب "سرور" رفیق سفر ہو تو اب "غم کیا" — اور بات ٹھیک ہی نکلی سرور صاحب کی معلومات سے اُردو ادب کی کتابوں سے متعلق نہ صرف اثنائے سفر میں استفادہ ہوتا رہا۔ بلکہ علی گڈھ پہنچ کر دوسری صبح کو انھوں نے اچھا خاصا وقت میرے لئے نکالا اور آزاد لائبریری اپنے ساتھ لے جا کر اُردو لغت کی کمیاب و نایاب کتابوں کا بڑا ذخیرہ میرے لئے نکلوایا اور اس کے متعلق اپنی معلومات سے پوری مدد فرماتے رہے۔ جتنا وقت ان کے ساتھ گذرا اور دل ان کے شکریہ سے لبریز رہا۔"

(صدق جدید ۹ر دسمبر ۱۹۶۶ء ص ۵ کالم ۲)

لطیفہ نہیں خبر

"نئی دہلی ۱۸ر مارچ صدر جمہوریہ نے آج اپنا خطبہ افتتاحی پارلیمنٹ کے سامنے شستہ انگریزی میں سنایا اور اس کا ہندی ترجمہ نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے کیا۔"

ڈاکٹر صاحب کا تعارف ناتمام رہا۔ اس لئے ان کے ہندی ترجمہ میں کچھ لطیف نہ آیا۔ پورا تعارف یوں کرانا تھا۔ سابق صدر انجمن ترقی اُردو اب ان کی زبان سے ہندی ترجمہ لطف دے گا۔

آزادی کے کچھ ہی روز بعد ایک معروف و مشہور و کہنہ مشق ہندو اہل قلم نے ایک مزاحیہ مضمون شائع کیا کہ میں عالمِ خیال میں دہلی پہونچا اور مولانا ابوالکلام سے ملنا چاہا۔ ایک ایک سے پتہ "وزیر تعلیم" اور "ایجوکیشن منسٹر" کا پوچھا کوئی میری بات ہی نہ سمجھا۔ بڑی ٹھوکریں کھانے کے بعد بالآخر ایک رہنما ہاتھ آئے انھوں نے کہا کہ "اچھا آپ "اَبُ الکلام آجاد" کو پوچھتے ہیں۔ تو "شکشا منتری" کہہ کر پوچھیئے" خیر یہ صاحب کسی طرح مولانا کے کمرے تک پہونچے۔ انھیں یقین تھا کہ جب کمرے میں پہونچیں گے تو مولانا کو خالی وقت میں دیوان نظیری یا کلیات عرفی کا مطالعہ کرتے پائیں گے، جب کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ مولانا سر جھکائے تلسی داس کی ہندی رامائن کے مطالعہ میں لگے ہوئے ہیں۔! — یہ تازہ خبر کہیں اسی مبتدا کی خبر تو نہیں۔ سنجیدہ واقعیت پرانے لطیفہ کے ٹکر کی — !"

(صدق جدید ۳۱ رمارچ ۱۹۶۷ء ص ۲ کالم ۲)

اس کو کہتے ہیں طنز، ایک تیر سے دو شکار اور ایک ہی بار میں سارے حساب صاف، سابق وزیر خارجہ مسٹر چھاگلہ پر "عزتمآب" کی پھبتی "عزت مآب سے تمسخر" میں اس کارٹون کے بارے میں ملاحظہ ہو جو دہلی کے ممتاز ہفتہ وار "ٹھاٹ" نے شائع کیا تھا:-

"درمیان میں نئی حسینۂ عالم سر پر تاج دیے ...... میں ملبوس رقص کر رہی ہے۔ داہنے پر امریکہ کا مشہور مسخرہ ایکٹر باب ہوپ ہے۔ اور اس کے بائیں پر ہمارے عزت مآب وزیر خارجہ سر کے سر پوش سے لیکر پیر کی جوتیوں تک ٹھیک

مسخروں کی وضع و لباس میں جلوس رقص کرتے جاتے اور زبان سے فرماتے جاتے ہیں کہ "اگر مسخرے کے ساتھ ہی ناچنا ہے تو مجھ سے بہتر ہم رقص کہاں ملے گا"۔

(صدق جدید ۲ جنوری ۱۹۶۶ء ص ۲ کالم ۱، ۲)

صاحبِ صدق کے طنز کی ایک خاراشگاف جھلک "فطرت کا گہرا طنز" میں دیکھیے :-

"صدر جمہوریہ ہند مسٹر گری کا خیر مقدم ازبکستان میں "کثرت اولاد پر وزیر اعظم ازبکستان کی طرف سے دلی مبارکباد"۔ مسز سرسوتی گری کا اگر ازبکستانی ہوتیں تو انھیں بہترین ماں کا اعزاز ملتا۔"

اور یہ سب عین اسوقت جب ہندوستان میں ہفتہ خاندانی منصوبہ بندی منایا جا چکا تھا اور جہاں اولاد کی بندش اور حد بندی پر چھپنے والے بے شمار سرکاری پوسٹروں، ہینڈبلوں، کتابوں اور اعلانوں کی سیاہی ابھی خشک نہیں ہوئی تھی :-

("صدق جدید" ۹ اکتوبر ۱۹۶۷ء ص ۲ کالم ۲)

صاحبِ صدق کے مرقعے بھی قابلِ دید و تحسین ہیں۔ جس چیز کا بیان کرتے ہیں اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھما دیتے ہیں۔ "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" کے سالانہ اجلاس کی سیر آپ ان کی چشم قلم سے فرمایئے :-

"...... وہ دیکھیے، نواب محسن الملک فصاحت کے دریا بہا رہے ہیں، اور اب دیکھیے شمس العلماء مولانا نذیر احمد دہلوی خطابت کے جوہر دکھا رہے ہیں وہ دیکھیے قاری شاہ سلیمان پھلواروی آئے، اور آپ جب چاہیں گے رُلا دیں گے، پردہ اور ہٹا۔ اب اسٹیج پر علی امام کا قبضہ ہے۔ اور اب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اپنی تقریر سے دل ہلا دیئے دے رہے ہیں۔ ادھر شوکت علی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے گرج رہے ہیں۔ ادھر محمد علی دلوں کو گرما رہے ہیں۔ مولانا شبلی کا فاضلانہ تاریخی خطبہ ابھی ختم

ہوا ہے۔ اور اب حالیؔ کی زار نالی ہے۔ دلوں کے پتھر موم کی طرح پسیجیں گے ـــــ صدر ہمیشہ کوئی نہ کوئی چوٹی ہی کا منتخب ہوتا۔ سرآغا خاں، جسٹس سید امیر علی۔ نواب صاحب ڈھاکہ، راجا صاحب محمود آباد، سید حسین عماد الملک بلگرامی۔ جسٹس بدرالدین طیب جی سب اپنے اپنے جلوے دکھا کر رخصت ہو گئے۔ ایک ایک صدر کے خطبۂ صدارت کے سننے کو لوگ ایک دوسرے پر پلے پڑتے۔"

(صدقِ جدید، ۱۴ جنوری ۱۹۶۶ء ص ۱ کالم ۲)

صاحبِ "صدق" بڑے معرکہ کے انشائیہ نگار ہیں۔ "اکنی"، "جانگھیا"، "ریل کا سفر" "قصبۂ گدیا"، "قرض"، "عدالت"، "خاندانی قبرستان"، "ایک مثالی اسٹرائک"، "اتوار"، "موسم" اور "اٹھارویں دن" وغیرہ ان کے ایسے شاہکار انشائیے ہیں جو نہ صرف "ایسے" (ESSAY) کی مغربی تعریف پر پورے اُترتے ہیں بلکہ مشرق اور مغرب کے کسی بھی انشائی انتخاب کے مقابلے میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ خاص طور پر "اکنی"، "جانگھیا"، بابوجی اور اتوار اُردو کے انشائی ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

اکنّی

"نئی دہلی سے ایک سرکاری اعلان "اکنی" بطور قانونی سکّہ کے یکم جنوری ۱۹۶۴ء سے ختم کر دی جائے گی۔"

دنیا کی ہر چیز کی طرح سکّوں کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ دینار، درہم، تنکہ، فلوس دھیلی، پاؤلی، کو آج کون جانتا ہے اور آنا اور پائی اور اُدھنا اور دُونی اور پیسے اور گنڈا اور دھیلا اور کوڑی تو ہمارے آپ کے سامنے ہی مردہ ہوئے ہیں۔

اکنی کا شمار کوئی بہت پرانے سکّوں میں نہیں بلکہ زیادہ عمر لوگوں کو تو ابھی اس کا اجرا، یاد ہوگا۔ ۱۹۰۷ء ہی سے تو چلی تھی (لارڈ کرزن نے رفاہِ خلق کے خیال سے اس کے اجرا کی تحریک ۱۹۰۶ء میں کی تھی) پہلے کوڑی اور پھر بعد کو دھیلے کا دور ختم ہونے کے بعد اب غریب غربا، بلکہ متوسط الحال لوگوں کا بھی سب سے

زیادہ محبوب اور مرغوب، کارآمد اور چلتا ہوا سکہ یہی تھا۔ اور کتنی خوشگوار یادیں بچپن سے لیکر اب تک کی، نکل کے اس چھوٹے سے سکہ سے وابستہ ہیں۔ ایک آنہ کی مونگ پھلی سے جیب کیسی بھر جاتی تھی۔ ایک آنہ کی مٹھائی اتنی مل جاتی تھی کہ کئی کئی حصے اس میں لگ جاتے ہیں تھے۔ پلیٹ فارم ٹکٹ ایک آنہ کا اخبار کا پرچہ ایک آنہ میں، ریلوے ٹائم ٹیبل ایک آنہ میں، کباب روٹی کا ناشتہ ایک آنہ میں، لسی کا گلاس ایک آنہ میں، چائے کی پیالی ایک آنہ میں، برف کی قفلی ایک آنہ میں۔ نمائش میں داخلے کا ٹکٹ ایک آنہ میں۔ قلی کی مزدوری ایک آنہ، یکہ کا کرایہ ایک آنہ — غرض ہما شما کا حاجت روا ایک آنہ!

اشرفی اور سادرن اور گنی جس طرح دیکھتے دیکھتے عنقا ہو گئیں، اسی منزل کی طرف اکنی بھی چلی اور چند روز بعد بس اس کا نام ہی سکوں کی تاریخ میں باقی رہ جائے گا اور شکل شاید عجائب خانوں کی الماریوں کے اندر ہی نظر پڑے۔

غم اس کے جانے کا نہ کیجئے، جو چیز آتی ہے جانے ہی کے لئے تو آتی ہے۔ خواہ جلد، خواہ بدیر، سوچئے یہ کہ بے شمار اکنیاں جو آپ کے ہاتھ سے نکلیں وہ کس مد میں اٹھیں، موقع خیر پر یا اس کے برعکس؟ ایسی کہ جو آپ کے لئے دائمی راحت و مسرت کا باعث ثابت ہونگی (یا کم سے کم یہ کہ ان کے صرف سے متعلق کوئی باز پرس نہ ہو گی) یا یہ کہ خدانخواستہ آپ کے لئے وبالِ جان اور موجب حسرت و حرمان نکلیں گی — تلافی و تدارک کا موقع تو انسان کی آخری سانس تک باقی رہتا ہے۔"

(صدق جدید اگست ۱۹۵۳ء)

جانگھیا

"جانگھیا بھی لباسوں میں کوئی لباس ہے؟ محض رانیں ڈھکی ہوئیں باقی ساری ٹانگیں کھلی ہوئیں۔ کسی بھلے آدمی سے محض جانگھیا پہن کر باہر نکلنے کی فرمائش کیجئے اردو خط میں لکھا جائے تو عجب نہیں کہ وہ منہ نوچ لے۔

لیکن جانگھیا کے بجائے نیکر (NICKER) بول دیجئے تو دیکھئے کہ معاً وہی اہانت عزت میں اور وہی گنوارپن فیشن زندگی میں تبدیل ہوا جاتا ہے — ! اس لئے شاید اور محض اسلئے کہ "جانگھیا" دیسی ہے اور "نیکر" ولایتی! — آج کوئی ہمارے سامنے دسترخوان پر صبح ناشتہ کے وقت گھی میں چپڑی ہوئی روٹی پیش کر دے تو ہم اپنے دل میں کہیں اور ممکن ہے کہ زبان پر بھی لے آئیں کہ یہ کیا واہیات کھانا اور کیسا گنوارپن ہے حالانکہ ہمارے باپ دادا اسے بڑی خوشی سے کھاتے آئے ہیں لیکن اگر کہیں بریک فاسٹ کے وقت میز پر نان پاؤ کے ٹکڑے مکھن کے ساتھ آجائیں تو پھر دیکھئے ہم کس رغبت و شوق سے اس پر ٹوٹتے ہیں! یہ کیوں؟ اس لئے کہ گھی چپڑنا کہنگی کی یادگار اور قدامت پرستی کی علامت ہے۔ اور مکھن لگانا خاص ماڈرن ازم کی دلیل آپ ذرا کسی سفید پوش کو موچی کہہ کر پکاریئے پھر دیکھئے وہ آپ پر کس طرح برس پڑتا ہے۔ لیکن اسی کو اگر شوز مرچنٹ کہہ کر مخاطب کیجئے تو دیکھئے وہ کس نیازمندی سے آپ کا استقبال کرتا ہے! حالانکہ دونوں لفظوں کے مفہوم میں کیا فرق ہے۔ بجز اس کے کہ ایک میں سماجیت کی جھلک ہے۔ اور دوسرے میں ہندوستانیت کی بو! — گلی ڈنڈا آپ کھیلئے تو وحشی ہیں۔ جانگلو ہیں۔ غیر مہذب ہیں — لیکن کریکٹ کے لئے گیند بلّا ہاتھ میں لے لیجئے تو مہذب ہیں۔ کلچرڈ ہیں۔

کھانے پینے، کھیلنے کودنے، اوڑھنے پہننے، رہنے سہنے، لکھنے پڑھنے غرض معاشرت و معیشت کا کوئی سا بھی شعبہ لے لیجئے۔ ہر جگہ آپ ظہور اسی کا پائیں گے۔ کہ آپ اپنے کو بے اختیار بھولتے جاتے اور "صاحب" کے دامن کو بے ساختہ پکڑتے جاتے ہیں! "صاحب" ملک چھوڑ کر چلے بھی گئے جب بھی صاحبیت کا بول بالا اور اقبال ترقی پر بدستور ہے!"

صاحبِ "صدق" کے خاکے بھی خاصے کی چیزوں ہیں۔ انھوں نے جو خاکے اڑائے ہیں ان میں عمومی کردار بھی ہیں ہماری روزمرہ کی زندگی کے جیتے جاگتے، ہنستے بولتے، مشینی

زندگی کا پرزہ بنے بھاگتے دوڑتے اور خصوصی بھی اور غیر مرئی بھی ——— اِن کے مشہور کردار "پیرو میاں" اور "بابو جی" سے ملیے :۔

"میاں پیرو قصبہ کے جانے پہچانے جراح ہیں. بوڑھے بچے سب ان کے معتقد ہیں ہندو مسلمان سب ان کے کمال فن کے قائل ہیں. صبح منہ اندھیرے اپنا بقچہ، جراحی بغل میں داب کر نکل جاتے ہیں اور دو دو تین تین میل کے دیہات کا پیدل گشت لگا دوپہر سے قبل اپنے کچی دیواروں اور کچی چھت والے گھر واپس آجاتے ہیں۔ اور اس وقت دو چار روپے ان کی جیب میں ہوتے ہیں. کبھی کبھی اور دُور جانا ہوا تو قسمت سے یکہ کی سواری بھی نصیب ہو جاتی ہے۔ آلات جراحی میں ان کے پاس ...... بس ایک نشتر ہے وہ بھی نیا نہیں بلکہ انھیں کی طرح سال خوردہ اسی سے وہ پھوڑے پھنسیوں میں شگاف لگا دیتے ہیں اور بقچے کے اندر خانہ دار بکس میں تین چار طرح کے مرہم ہوتے ہیں۔ کوئی لال، کوئی سفید، کوئی زرد، ایک مرہم زنگاری "ہوتا ہے اس کی وہ خود اور ان کے مریض بڑی تعریف کیا کرتے ہیں. زخم کیسا ہو، اس سے بھر جاتا ہے. یہ سارے مرہم جڑی بوٹیوں ہی کے بنے ہوتے ہیں. اور انھیں میں جراح صاحب کی حذاقت اور مسیحا نفسی کا راز چھپا ہوا ہے۔ جراثیم کش اور (Antiseptic) صابن اور عرق سے وہ ہاتھ دھونا جانتے ہی نہیں اور نہ شاید یہ ان کے کان تک پہونچے ہوں. یہ سب اس لیے کہ وہ محض "جراح" ہیں.

شہر کے مشہور سرجن ڈاکٹر صدیقی کا نام تو آپ نے بھی سنا ہو گا۔ شہر میں بھی فیس معقول ہے۔ اور باہر جانے کی تو کچھ سو یومیہ ہے۔ ذاتی کوٹھی کے علاوہ مطب کی بھی عالی شان عمارت در و دیوار اتنے شفاف کہ گمان آئینہ کا ہونے لگے۔ فرش اتنا چکنا کہ پائے نظر پھسل جانے کا احتمال ہو. چھوٹے بڑے. نازک و نفیس اور خوفناک و خونخوار دونوں قسم کے آلات جراحی کا وہ ذخیرہ کہ کنسلٹیشن روم کے ڈانڈے میوزیم

ڈبے مل جائیں۔ دو دو کمپاؤنڈر ہر وقت کربستہ سفر عموماً فرسٹ کلاس میں کبھی کبھی ایرکنڈیشنڈ ڈبے میں۔ اور زیادہ دُور کا سفر ہوائی جہاز پر۔ ماہانہ آمدنی کا اوسط کئی ہزار کا۔ ـــــــ یہ سب برکت اس کی کہ وہ "جرّاح" نہیں۔ ماشاءاللہ "سرجن" ہیں!

(صدق جدید۔ ۱۶ر دسمبر ۱۹۶۶ء ص ۱)

دفتر کھلا اور بابو جی اگر بہت جلدی آگئے، تو بھی اس کے آدھے گھنٹے بعد تو بہر حال آئے اور کم سے کم ۱۰ منٹ توانپی ڈسک کے کاغذات اور فائلوں کے ٹھیک ٹھاک کرنے میں صرف کئے، سُست روی اور سُست رفتاری تو جیسے ان بابو صاحب پر ختم ہے ـــــــ اور یہ بظاہر اب کام چالو ہوا۔ لیکن معاً چائے نوشی کے دور اول کا وقت آگیا اور ۲۵ منٹ اسی دور نے لے لئے اور یہی رفتار کام کی، آفس کے آخر وقت تک چلتی ہے۔ ہر تھوڑی دیر کے بعد چائے کا نیا دور چلتا ہے۔ کچھ دیر اور گذرتی ہے کہ "لنچ آور" (کھانے کا گھنٹہ) آجاتا ہے۔ خدا جانے انگریزی دور میں عملہ والوں کی یہ بھوک کہاں چلی گئی تھی۔ اس کی مدّت کہنے کو تو آدھ گھنٹہ ہے۔ لیکن عملاً یہ ایک گھنٹے سے بھی زیادہ لمبا ہوتا ہے پھر ساتھیوں اور دوستوں کے پاس اُن کے ڈسک پر جانا اور گپ زنی بھی تو کرنی ضروری ہے۔ اور گفتگو سیاسیات سے لیکر جنسیات تک دنیا کے ہر پبلک اور نجی موضوع پر ہوتی ہے۔ بجز اپنے کام کے۔ اور ذمہ داری کے بجائے تفریح، لاابالی پن بے فکرے پن کا سایہ شروع سے آخر تک چھایا رہتا ہے!"

دفتر کے بند ہونے میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی ہوتا ہے اور کل ۴½ ہی بجا ہوتا ہے کہ بابو صاحب فائلوں کو اٹھا کر اور گھر چلنے کی تیاری شروع کر دیتے ہیں اور دن بھر کی کاہلی اور سستی کا کفارہ اس وقت کی چستی اور مستعدی سے کر دیتے ہیں۔ اور اگر کوئی شامت کا مارا ضرورت مند اس وقت نازل ہوگیا تو اس کے لئے بہ ترشا ترشایا جواب رکھا ہوا ہے کہ بس اب کل آیئے گا آج تو بہت دیر ہو گئی ہے۔ حاضری کے رجسٹر بھی دفتروں میں

رکھے رہتے ہیں لیکن ان کی خانہ پری صحت و دیانت کے ساتھ کرانا کس کے بس کی بات ہے ۔؟ افسروں کا تجربہ ہے کہ ڈانٹ ڈپٹ اور سمجھاؤ، بجھاؤ کی ساری حکمتیں ناکام اور بے اثر ثابت ہوئی ہیں۔ اور آخر میں خود انہیں کو تھک کر ہتھیار ڈال دینے پڑے ہیں۔ زیادہ ضابطہ برتئے تو خود افسر صاحب کی خیر نہیں۔ آخر ہر بابو صاحب کی رسائی کسی نہ کسی ممبر اسمبلی یا ممبر پارلیمنٹ تک ہے ہی۔ اور ہر ایک کوئی نہ کوئی مضبوط ہی پایہ تھامے ہوئے ہے ۔ اب ۔ اور ایک کھلا ہوا جواب تو ہر بابو کی زبان پر رکھا ہی ہوا ہے کہ صاحب کام ہو تو کیسے۔ افسروں کو کانفرنسوں اور کمیٹیوں ہی سے کہاں چھٹی ملتی ہے ۔"

(صدق جدید ۹ فروری ۱۹۶۸ء ص ۱)

"یادِ رفتگان کے سلسلے میں صاحبِ "صدق" نے اگلے وقتوں کے لوگوں کے جو خاکے کھینچے ہیں اُن کو اگر مرقع کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ان خاکوں میں اختصار ہے دہی اختصار ہی صدق کا طرۂ امتیاز ہے۔ اثر لکھنوی ، اسٹالن ،عطیہ فیضی مولوی مسعود علی ندوی ، علی عباس حسینی ، شفاء الملک ، حکیم عبدالطیف ، مولانا اختر علی تلہری ، شفاء الملک حکیم خواجہ شمس الدین اور احمد غریب مرحوم وغیرہ کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اگر ان کا مقابلہ ان طویل ترین ماتمی مقالات سے کیا جائے جو ان سب پر لکھے گئے ہیں تو یہ بہت بھاری پڑیں گے دوسروں کے مضامین کے بارے میں اس وقت کچھ عرض نہیں کرنا ہے مگر نمونتاً ان کے زعفران کی ایک پڑیا کھولتا ہوں :۔

"مولوی مسعود علی ندوی مرحوم ...... شہرت نے لڑکپن ہی سے قدم لینے شروع کر دیئے تھے۔ آج طلبار کی اس ٹولی کے سردار، کل اسٹرائک کے علمبردار، مولانا شبلی پر اپنے حُسنِ خدمات سے سکہ بیٹھا دیا تھا۔ استاد کی وفات کے وقت جب علمی جانشینی کی دستار فضیلت سید سلیمان کے سر بندھی ، تو دار المصنفین کے پریس اور سارے

کاروبار کی منیجری کا خلعت انھیں کے جسم پر راس آیا اور مدتوں اسے خوب ہی انھوں نے نباہا۔

ٹینس کے اچھے کھلاڑیوں میں شمار ہوتے تھے، شکار کے شوقین اور دوڑ دھوپ کے ہر کام میں منجھے ہوئے تھے۔ سانپ کو دوڑ کر مارتے تھے۔ خوش انتظامی، خوش دماغی، اور جفاکشی کے پتلے تھے۔ اور زندہ دلی، شگفتہ مزاجی کے بادشاہ، روتوں کو جب چاہا ہنسا دیا۔ روٹھوں کو جب چاہا منالیا۔ نام مسعود کی مناسبت سے پورا نام "سالار مسعود غازی" ہم نیاز مندوں کی زبان پر چڑھا ہوا تھا ــــ مزاحاً مجھے "میاں" کہہ کر مخاطب کرتے رہے اور میں نے بھی جواب میں انھیں "استاد" کہنا شروع کر دیا تھا۔"

(صدق جدید، ۸ ستمبر ۱۹۶۷ء ص ۴ کالم ۱)

"آپ بیتی" بہتوں نے لکھی ہیں اور کتنوں کی آپ نے پڑھی بھی ہوں گی مگر یہ البیلا انداز کا ہے کو نظر سے گذرا ہوگا:-

عمر کا پچھتروا‌ں سال

"...... پیدائش وسط مارچ ۱۸۹۲ء کی ہے۔ اس حساب سے آج عمر کا پچھتروا‌ں سال شروع ہوگیا! ــــ بات کہنے میں پانچ سکنڈ میں ختم ہوگئی، حسرتوں کا دفتر جو اس کے عقب میں ہے۔ اس کی شرح و بیان پر اگر آیئے تو گھنٹوں اور دنوں ہفتوں اور مہینوں کا کیا ذکر ہے۔ ساری عمر کی عمر کو ناکافی پایئے!

بچپن میں کسی کا سن ۴۰ ــ ۵۰ کا سنتا تو یقین کر لیتا کہ وہ پورے بڑھاپے کو پہنچ چکا۔ جب اپنا سن چالیس کا ہوا تو دل نے کہا کہ یہ سب غلط ہے ابھی تو پورا جوان ہی ہوں۔ جب ۵۰ کا ہوا تو نفس نے ایک بار پھر نا دلی کی کہ بڑھاپا ابھی دور ہے

اب تو ادھیڑ سن کا ہوا ہوں۔ دس سال کی لمبی اور بہ ظاہر بہت بڑی مدت بھی آناً فاناً اور گذر گئی۔ اور اب واقعہ کی تکذیب کی مزید سکت نہ رہی۔ پھر بھی دل (اور دل بہ معنی نفس) جوان کا جوان ہی رہا۔ کسی حرص و ہوس میں، غفلت میں، حُب دنیا میں کوئی فرق نہ آنے پایا۔ ۶۵ کی منزل آئی۔ اور پھر ۷۰ کی۔ یہاں تک کہ اب ۷۰ ویں شروع ہوگئی اور بس نہیں چلتا کہ عمر گریزاں کی برق رفتاری کو روک دیا جائے۔ ماہ و سال کے حساب کو آگ لگا دی جائے اور دنیا بھر کی جنتریوں اور کلنڈروں کو پھاڑ کر پھینک دیا جائے —! بڑھاپا کیسا! ہر آرزو تازہ! ہر ہوس زندہ! نفس کا ہر شعلہ بدستور دہکتا ہو!

پیدائش ایک کھاتے پیتے دین دار گھرانے میں ہوئی۔ نعمتیں بے شمار حاصل ہوئیں۔ دنیا کے لطف ہر طرح کے دیکھے۔ بہار کے ساتھ خزاں بھی آئی اور گذرتی رہی۔ پڑھنے لکھنے کی ہوس گویا مادر زاد تھی۔ اسی کے طفیل نوجوانی میں فرنگی علوم کا نشہ سوار ہوا۔ اور بدمستی، الحاد اور (عقلیت) لادینیت کے دروازے تک کھینچ لائی۔ عمر عزیز کے دس سال اسی گمراہی اور برگشتگی کی نظر ہوگئے۔ اس کے بعد اسم ہادی کی تجلیات نے پھر زور باندھا اور جس طرح دبے پاؤں ایمان کی روشنی رخصت ہوگئی تھی اسی طرح تشکیک و انکار کی تاریکیاں بھی کافور ہوئیں۔ اور پھر قسمت نے دستگیری کرکے مرشد تھانوی کے آستانہ تک پہونچا دیا۔ طبعی حادثے اور ایسے جیسے سب کو دیکھنے پڑتے ہیں۔ اپنے بھی حصّے میں آتے رہے۔ جیسے ماں باپ کو بھائی بہن کی۔ اور چھوٹی اولاد کی مفارقت اور ہر زخم اپنی جگہ بھرپور ہی پڑا۔ عقلی، دینی اور ایمانی نوعیت کے صدمے جو اُٹھانے پڑے۔ وہ ہوش ربا بھی تھے۔ کون جان سکتا تھا کہ خلیفۃ المسلمین کا شرعی منصب جو تیرہ سو سال سے نسل بہ نسل مسلسل چلا آرہا تھا یوں خاموشی کے ساتھ اور دفعتہً ختم ہوجائے گا۔ اور ادارہ خلافت رسول کی دنیائے

اسلام یوں بھول جائے گی کہ جیسے یہ کبھی تھا ہی نہیں! اور رہا ہندوستان کے اندر کا انقلاب در انقلاب تو کوئی اس کے تاثرات لفظ و عبارت ضبط و قید میں کیوں کرے آئے ـــ!

ان آنکھوں سے اپنے سامنے اٹھتے ہوئے پیکر ایمان و صدق محمد علی اور حسرت موہانی کو دیکھا۔ شبلی کو دیکھا، اقبال کو دیکھا، بہادر یار جنگ کو دیکھا۔ شقاوتِ قلب کا یہ عالم رہا کہ قدر ان میں سے کسی کی بھی نہ کی، مرتبہ ان میں سے کسی کا بھی نہ پہچانا ـــ جو کچھ بھی دیکھا۔ اُس کے بعد شاعر کی ہدایت تو یہ تھی ؎

وقتِ طلوع دیکھا، وقتِ غروب دیکھا
اب فکرِ آخرت ہے، دنیا کو خوب دیکھا

یہاں فکرِ آخرت مرتبہ "خوب" میں کیا ہوتی، معمولی اور درجہ اوسط کی بھی نصیب میں نہ آتی! ـــ اور حقوق کی ادائیگی کی توفیق نہ خالق کے مقابلے میں ہوئی نہ مخلوق کے سے حق ادا نہ بڑوں کے ہوتے، نہ چھوٹوں کے نہ شاگردوں کے، نہ پڑوسیوں کے، نہ اہل خدمت کے ـ طاعتوں سے کورا، اور عبادتوں سے مُعرّا، جس طرح آغاز میں تھا معلوم ہوتا ہے کہ انجام تک وہ نقشہ نہ بدلا!

لکھنؤ میں ایک شاعر تھے ـــ (۱)..... اور غزل سے بڑھ کر ہزل سے ذوق رکھنے والے ـ لیکن قادرِ مطلق جس کی زبان سے جو چاہے سنوار دے۔ اُن کا یہ شعر جب پہلی بار سننے میں آیا۔ تو جسم پر ایک سناٹا سا چھا گیا ؎

محشر میں جو شیخ آئے تو اعمال ندارد
جس مال کے تاجر تھے وہی مال ندارد

اور دل نے کہا یہ اور کسی کے حق میں ہو یا نہ ہو اس کم نصیب کے حق میں

---

(۱) ماچس لکھنوی مرحوم

تو ضرور ہے ـــ اس پر خود غلط کو تھوڑا بہت بھروسا اپنی خدمت قرآن کا ہے ـــ حالانکہ اس سارے دفتر میں اس کے سوا اور ہے ہی کیا کہ کچھ اس کتاب سے نقل کر دیا. اور کچھ اس کتاب سے تو جب یہ عوامی زبان میں "شیخ کہلانے والے محشر میں لائے گئے ـــ تو وہاں قدرتاً پرسشش اقوال کی نہیں، الفاظ کی نہیں، اعمال کی ہوئی ـــ یہاں ان کا سرمایہ تھا ہی کہاں. جو پیش ہوتا ـــ " اعمال ندارد" جو کچھ تھا. وہ تو صرف مال تجارت تھا ـــ کہ دوسروں کو کچھ سنا دیا ـ کچھ بتا دیا. اس کاروبار سے اپنی اصلاح کیا ہوتی. اپنے قلب میں تزکیہ و تصفیہ کیا ہوا. اپنی روح میں جلا کہاں سے پیدا ہوئی." جس مال کے تاجر تھے وہی مال ندارد."

عین اسوقت تفسیر کا مسودہ نئے اڈیشن کے لیے صاف ہو رہا ہے. بلکہ کچھ حصہ کی کتابت بھی ہو چکی ہے اس جدید مسودہ کی تیاری میں ـ ترمیم و اضافہ میں، حک و اصلاح میں، مہینوں کی نہیں برسوں کی لگی ہے ـــ لیکن یقین کیجیے کہ جب بھی کسی پچھلے مسودہ پر نظر پڑتی ہے ـــ بس جی یہی پکار اٹھتا ہے کہ اسے توڑ ہی کر دیجیے یہ چھپنے کے قابل ہی نہیں! ـــ بس ایسے ننگ خلائق کے کام کی لاج رکھنا تو بھی اسی کا کام ہو سکتا ہے جو اگر چاہے ـ تو مقہوروں کو مقبولیت سے نواز دے. اور امداد کرے ..... تو ابلیس تک کو پروانہ مغفرت سنا دے ـ!

(صدق جدید ۲۰ مارچ ۱۹۶۲ء ص ۲،۱)

صاحبِ "صدق" کے سفرنامے خاصے دلچسپ ہیں ان کی نگاہ سیاح کی اور جزئیات کے بیان میں داستان طرازی کا اندازہ عام ہے." سرکاری تقریب" جس میں" عربی اسکالر" کی سند اعزاز انھیں پیش کی گئی تھی. اس کے بارے میں دیکھیے ان کا قلم کیا گل کھلاتا ہے :ـ

"..... دربار میں حاضری کا زندگی میں یہ پہلا موقع تھا..... اللہ اللہ!

کیا شان وآن، کیا جاہ وجلال ہے! زینت وجمال کا کمال اگر شاہی محل میں بھی
نہ ہوگا تو اور کہاں ہوگا۔؟

کمروں کی تعداد ..... برآمدے، ہال، گیلریاں، صحن، چمن، نشاط خانے
کھیل گھر، تالاب، حوض، غسل خانے، باورچی خانے خدا معلوم کتنے، وسیع وبلند
برآمدے ...... قدم قدم پر چوکی پہرے، باہری پھاٹک سے ایک دربانوں،
محل داروں کی پلٹن، بلم بردار، مسلح سپاہیوں، محافظوں کی فوج۔ اور انھیں
کے درمیان وہ رہ رہا ہے جو "جمہوریہ" ہند کا صدر ہے..... قیام کل ڈیڑھ دن
رہا۔ دلی کے سے "غدار" شہر میں یہ مدت ہی کیا ہوتی ہے......"

(صدق جدید ۵ رمئی ۱۹۶۷ء ص ۵، ۶)

"چند گھنٹے علیگڑھ" میں لکھتے ہیں:۔

"..... رقبۂ یونیورسٹی کی توسیع۔ شاندار عمارتوں کی افزونی، لائبریریوں
کے اندر کتابوں کا اضافہ ان سب چیزوں کو نہ پوچھئے چلتے، چلتے تھک جایئے۔
اور عمارتوں کا سلسلہ ختم نہ ہو، یہ مڈیکل کالج وہ پالی تکنیک، یہ فلاں ہوسٹل
وہ فلاں لیبوریٹری اور بڑی آزاد لائبریری کے علاوہ نسبتۃً چھوٹی اسلامک اسٹڈیز
لائبریری کے حدود میں اگر پہونچ جایئے تو سامان اپنے انداز وشوق سے بھی کہیں بڑھ
کر پایئے، آنکھیں پڑھتے پڑھتے تھک جائیں اور کسی ایک شعبہ کا ادنیٰ جز بھی احاطہ
میں نہ آنے پائے "علوم وفنون" جیسے کہ وہ ہیں۔ ان کی تحصیل اور ان میں تکمیل
کے لئے بہترین اڈے"

(صدق جدید ۹ ردسمبر ۱۹۶۶ء ص ۵ کالم ۲)

"دو دن بھوپال میں" بھی اس سلسلے کی خاص تحریر ہے مگر اس میدان میں
ان کا اصل کارنامہ ان کا حج کا سفرنامہ ہے۔

صاحبِ صدق کے بڑے کارناموں میں ان کی بہتیری نشری تقاریر کا بھی شمار رہے گا۔ "منشی سجاد حسین" "طرحدار لونڈی" "اکبر الہ آبادی" "مرزا رسوا" اور امراؤ جان ادا" اور اس طرح کے نہ جانے کتنے علمی، ادبی اور تہذیبی گوشے ہیں جو نشریاتِ ماجد' میں محفوظ ہیں عام طور سے وہ عام اور ادبی جلسوں میں تقریر نہیں کرتے لیکن عرصہ بعد ۳۰ ستمبر ۱۹۶۷ء طلبہ، ندوہ کی مجلس اصلاح کے جلسہ توسیع خطبات میں انھیں تقریر کرنا ہی پڑی اس "تقریر بے تاثیر" کی جھلک ملاحظہ ہو :۔۔۔

....." صورتیں اتنی ثقہ، سیرتیں اتنی پاکیزہ۔ لیکن جب زندہ دلی کا شگوفہ چھوڑنے پر آئیں تو اچھے اچھے دلگی بازوں کو نیچا دکھا دیں ...... علیگڈھ اور ندوے کے درمیان نہ وہ بیگانگی ہے اور نہ دوری جو فرض کر لی گئی ہے راہیں الگ الگ ہوں۔ درمیانی منزلیں بھی الگ ہوں لیکن دونوں کی ایک ہی منزل مقصود اور وہ کیا؟ یہی امت کی فلاح وبہبود! بس فرق اتنا کہ ایک نے لائبریری اور لیبا۔یٹری کو اپنایا اور دوسرے نے اپنا دل محراب ومنبر سے اٹکایا"......

پیام دنیا تو ندوے کا کام تھا خوش ہوئیے کہ آج سے دوسرے کا پیام سننے کی توفیق ہورہی ہے گفت سے کچھ کم نہیں یہ شنودِ حق کی بھی نہیں!"

(صدق جدید ۲۰ اکتوبر ۶۷ء ص ۵ کالم ۱، ۲)

صاحب صدق مشرقی تہذیب وتمدن کے ترجمان اور پاسبان ہیں۔ ان کی تحریروں میں معاشرتی جھلکیاں ہر رنگ میں اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ کس بے باکی کے ساتھ لکھتے ہیں :۔

جگت گرو کے چرنوں پر

"نئے صدر جمہوریہ جب کرسی صدارت پر بیٹھنے سے کچھ قبل جگت گرو شنکراچاریہ

(سرنگر) کی خدمت میں اشیرباد لینے کے لیے حاضر ہوئے تو شنکراچاریہ جی کے یہ بھی چھوئے ــــ یہ موقع فخر و مباہات کا یقیناً ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کس کے لئے ؟ آیا خود شنکراچاریہ جی کے لئے کہ ملک کے صدر کا سر ان کے آگے یوں جھکا؛ یا صدر محترم کے لئے جنھیں ملکش ہو کے جگت گرو کے پیر چھونے کی اجازت مل گئی۔!"

(صدق جدید ص ۳ کالم ۱ ۲۶ر مئی ۶۷ء)

اہل سیاست کی بدعنوانیوں پر لکھتے لکھتے ان کی بداخلاقی کے بارے میں "شرفائے شہر کی ڈھیلے بازی" کا کیا نقشہ کھینچ دیا ہے :-

"راجدھانی یعنی دہلی کی میونسپل کارپوریشن کے جلسہ منعقدہ ۱۷ر اکتوبر (میں) دس منٹ تک کانگریسی اور جن سنگھی ممبر ایک دوسرے سے گتھم گتھا. گھونسے اور مُکّے چلتے رہے۔

ایک دوسرے پر پیپر ویٹ پھینکے گئے۔ ایک چپراسی زخمی، کارپوریشن میں بھاگڈگی کا بے مثال منظر۔ ایک ممبر کی شرٹ چیتھڑے چیتھڑے۔

کاغذات اور میزیں ڈسک اور مائیکروفون سب الٹ پلٹ دیے گئے۔

"آزادی" ملک میں آئی لیکن آزادی بن کر نہیں، یکسر "طوفانِ بے تمیزی" بن کر! ملک کا کون ساخط اور زندگی وطن کا کون سا شعبہ اب بھرپور نفرت انگیزیوں سے خالی ہے؟ کاش یہ آزادی نہ ملی ہوتی ملک سراسر محکوم ہی رہتا۔ لیکن ہماری شرافت، ہماری خود داری، ہماری تہذیب و شائستگی کو دھبہ تو نہ لگتا اور ہمارے آبا رِ شہر نے ایک دوسرے پر ڈھیلے بازی تو نہ سیکھی ہوتی"!

(صدق جدید ۳ر نومبر ۶۷ء ص ۴ کالم ۱)

منظر کشی میں صاحبِ صدق کا قلم فوٹو کیمرے کے مترادف ہے۔ جس چیز کا بیان کرتے ہیں اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے رقصاں ہو جاتا ہے:۔

انسان کی بے بضاعتی کا نقشہ کھینچتے ہوئے مدھیہ پردیش اسمبلی میں کاروائی کے دوران معزز ممبروں پر شہد کی مکھیوں کے حملے کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

(چائے کے لئے) "آگ جلی تو دھواں پیدا ہوا اور دھواں چھتے تک جا پہنچا مکھیاں بھڑکیں اور بگڑ ئیں اور غضبناک ہو کر حملہ آور ہو گئیں۔ ان کا حملہ! معاذاللہ! گوی اور گوے سے بھی بڑھ کر بے پناہ! ابھی چپراسی کو کاٹا، ابھی دربان کو بھنبھوڑا یہ آئیں، وہ آئیں، اور لیجئے اب حملہ خود وزارت مآبوں پر شروع ہو گیا۔ نہ چوکیداروں کی لاٹھیاں کام آئیں۔ نہ کانسٹبلوں کے ڈنڈے۔ نہ منصب و مرتبہ کا رعب سپر بن سکا ...... وزیر باتدبیر اعزاز و وقار کا خیال کئے بغیر بے تحاشہ بھاگے۔ کسی نے کمل کے اندر گھس جان بچائی۔ کسی نے غسل خانے کے اندر اپنے کو بند کر لیا۔ جب کہیں مصیبتوں سے جان بچی........"

(صدق جدید ۱۶ جون ۱۹۶۷ء ص ۱ کالم ۱)

ترجمہ صاحبِ صدق کا خاص میدان ہے وہ اس کے مردِ میدان بھی ہیں، اور سالارِ کارواں بھی۔ عربی، فارسی، انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں سے ان کے اُردو تراجم ادبی اور علمی حلقوں میں گذشتہ نصف صدی سے داد و تحسین کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ صاحبِ صدق کا کارنامہ "تفسیر ماجدی" ہے فلسفہ، مذہب اور دوسرے علوم و فنون کے بارے میں ان کے یہ گرانقدر تراجم کسی تعارف کے محتاج نہیں ان کی ایک سرسری جھلک شاید کافی ہو:۔

"خلائی جہاز" کے سلسلے میں اس حدیث نبوی کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

فیبعث اللہ یاجوج   اسی حال میں اللہ قوم یاجوج کو

وماجوج وھم من کل حدب	اٹھا کر کھڑا کرے گا اور یہ
ینسلون فیقولون لقد	اوپر بلندی سے لپکتے جھپکتے ہوئے
قتلنا من فی الارض فلنقتل	دوڑیں گے (دنیا میں قتل وغارت کے
من فی السماء غیرلون	بعد) پھر کہیں گے کہ زمین والوں کو تو ہم
الی السماء	ختم کر چکے۔ اب آسمان والوں کو ختم کر
(جمع الفوائد میں یہ روایت صحیح مسلم ابوداؤد	لیں۔ پھر آسمان کی طرف اپنا تیر چھوڑیں
ترمذی اور ابن ماجہ کے حوالہ سے نقل ہوئی ہے)	گے۔

اور سب باتوں کو چھوڑیئے سر دست خیال اس جزیئے پر جایئے۔ کہ اس جدید ترین وبے پناہ حربے پر اطلاق "تیر" کا کس خوبی وصفائی کے ساتھ نگاہ کشفی نے کر دیا ہے۔"

(صدق جدید ۱۰ر فروری ۱۹۶۷ء ص ۱ کالم ۲)

صاحبِ صدق کے مختصر مگر جامع اور پر معنی تبصرے ان کے ادب اور صحافت کے باب میں ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں" تین مسافر" مصنفہ ڈاکٹر قطب النساء ہاشمی کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"...... "ساحل وسمندر" کتاب میں اصل موضوع سے ہٹ کر غیر متعلق باتیں بہت سی آگئی ہیں اور مولانا شبلی کے باب میں تو ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کے قول کو قابلِ اعتماد اور کسی حد تک مستند سمجھ لیا گیا ہے۔ واقعات اور زبان دونوں میں اصلاح ونظر ثانی کی گنجائش رہ گئی ہے۔ واقعات میں مثلاً یہ کہ آرنلڈ انگریزی کے پروفیسر تھے۔ (انگریزی کے نہیں فلسفہ کے تھے) یا یہ کہ ان کی کتاب پریچنگ آف اسلام "عربی کی تحقیق" میں ہے یا یہ کہ مولانا شبلی کی سیرۃ النبی کی تکمیل ۱۴ جلدوں میں ہوتی ہے۔ یا یہ کہ سرسید کے ایک اہم عمر مغکر مولوی وحید الدین سلیم بھی تھے۔ یا یہ کہ مسلم لیڈروں میں محمد علی، ابوالکلام کی طرح کوئی صاحب "مولانا" انصاری بھی تھے اور زبان

میں اسی طرح کے الفاظ و ترکیبیں "علماؤں" "واقعات کی کھوج" ذہن، تبسم وغیرہ"
(صدق جدید ۲ر دسمبر ۱۹۶۶ء ص ۶ کالم ۱)

صاحبِ صدق کی "سچی باتیں" ہوں "شذرات" یا دیگر کالم ان سب کا ایک بہت ہی واضح موقف اور بہت نمایاں پالیسی ہے اور وہ ہے مشرقی اقدار و روایات کی ترجمانی، ان کی نظریں ہمیشہ تلخ تر حقائق پر رہتی ہیں اسی لئے ان کی صحافتی تحریروں میں ادبیت کے ساتھ ساتھ اصلاحی طنز کی خار اشگافی نمایاں رہتی ہے۔ جس سے نہ اپنوں کو پناہ ملتی ہے اور نہ پرایوں کو۔

"سچ" اور پھر "صدق" کا ایک دلچسپ پہلو صاحبِ صدق کے ادبی معرکے ہیں۔ نیاز فتحپوری، جوش ملیح آبادی اور یگانہ چنگیزی سے لے کر حیات اللہ انصاری تک ان کے یہ معرکے ہماری، ادبی، تہذیبی، مذہبی، ثقافتی اور صحافتی زندگی کا ایک بہت ہی باغ و بہار پہلو ہیں۔ جب بھی اردو ادب کے ادبی معرکوں کی تاریخ مرتب کی جائے گی تو یقین ہے کہ اس کا یہ باب، اس اعتبار سے ضرور عجیب و غریب ہوگا کہ معرکہ کوئی بھی ہوا مگر آخر میں میدان انہیں کے سر رہا۔ اس کی شاید وجہ یہ ہے کہ صدق میں ادبی معرکے کی سج دھج اودھ پنچ سے کم نہیں ہوتی اودھ پنچ کے یہاں توازن کا اہتمام ذرا کم ہی نظر آتا ہے مگر یہ اس کے تمام فنی آداب برتتے اور کبھی جادۂ اعتدال سے نہیں ہٹتے۔ اودھ پنچ کا پورا توپ خانہ میدان سر کرنے کے لئے اُتر پڑتا تھا مگر صاحبِ صدق خود توپ خانے کی کمان ایک ماہر جنرل کی طرح سنبھال لیتے ہیں اور منزلیں مارنے میں عجلت سے کام لینے کے بجائے موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ ان کا حملہ ہمیشہ غیر متوقع اور فوری ہوتا اور یہ بھی ہوتا کہ حریف کو زک دینے کے لئے ان کی محض ایک پھبتی کافی ہو جاتی ہے اور پسپا ہونے والے کا بیان صفائی، چنیں، اور چناں ہفتوں بلکہ مہینوں جاری رہتا۔ مگر پھر بھی وہ مولوی مدن والی بات نہیں آپاتی۔

آخر میں اس اہم پہلو کی جانب اشارہ کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اردو نثر اور اردو طنزیہ ادب میں صاحبِ صدق کی مستقل اہمیت اور حیثیت ہمیشہ اس لئے رہے گی کہ ان کی تحریریں ادبی ہوں یا صحافتی، طنز و ادب کی دلآویز آمیزش اور فنی خوبیوں کے باعث وقتی یا ہنگامی ہونے کے باوجود مستقل اور دائمی حیثیت رکھتی ہیں۔ ظفر علی خاں کو شاعری میں جو ملکہ اور درجہ حاصل ہے کہ ہنگامی اور لمحاتی موضوعات کو انھوں نے ادبیت بخش دی، وہی شان صاحبِ صدق کی صحافتی اور ادبی نثری تحریروں میں ہے ان کا قلم لمحے اور لحظے کی سچائی کو ایسا اسیر کر لیتا ہے کہ اس کو نہ وقت کی گرد ماند کر سکتی ہے اور نہ ہنگامہ کے گذرنے سے ہنگامہ کی شدت اور تاثیر متاثر ہوتی ہے۔ یہی وہ خوبی ہے جس نے ان کی تحریروں کو آبِ حیات بخشی ہے اور کلاسک کا بلند درجہ عطا کیا ہے۔

اردو ادب کی طرح اردو صحافت اور طنز و ظرافت کے بقائے دوام کے دربار میں اسی لیے وہ ہمیشہ صفِ اول میں نظر آئیں گے اور وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں سے دلچسپی، مقبولیت اور افادیت میں مزید اضافہ ہوتا جائے گا مشرقی تہذیب و تمدن، ادب و صحافت، مذہب و ثقافت کا کوئی تذکرہ ان کے بغیر نہ مکمل سمجھا جائے گا، اور نہ مستند۔ ان کی تحریروں کی روشنی میں یہ ایک حقیقت ہے۔ ان کے طنز کی طرح تلخ، مگر حقیقت کی یہ تلخی بڑی خوشگوار، عزیز اور گوارا ہے۔

اب ضرورت ہے اس بات کی کہ ان کی تحریروں کو اردو "اکاڈمی" بیس پچیس جلدوں میں اس طرح محفوظ کر لے جیسے کہ قاضی عبدالودود اور کلیم الدین احمد وغیرہ کی تحریروں کی کتابی شکل میں محفوظ کیا جا رہا ہے۔

"ظریف اور سرپنچ"

سید مقبول حسین ظریفؔ لکھنوی "اودھ پنچ" کے خاص شاعر تھے اودھ پنچ کے پہلے دور میں اکبر الٰہ آبادی کی شاعری اپنے عروج پر تھی اور ظریفؔ لکھنوی، شہرت کی ابتدائی سیڑھیوں پر قدم رکھ رہے تھے۔ مگر اودھ پنچ کے دوسرے دور میں وہ اس ابتدا کی انتہا پر پہنچ گئی۔

انیسویں صدی کی تیسری دہائی تک پہونچتے پہونچتے اودھ پنچ کے ظریفوں کا شیرازہ بکھرنے لگا کچھ پیوند خاک اور کچھ خاموش ہو گئے۔ خود حکیم ممتاز حسین عثمانی کے لئے "اودھ پنچ" جاری رکھنا مشکل ہوگیا۔

ان حالات میں جب کہ اودھ پنچ مائل بہ زوال تھا ستمبر ۱۹۳۲ء میں "سرپنچ" کا اجرا ہوا، اس کے مالک نسیم انہونوی نے شوکت تھانوی کو "سرپنچ" کا ایڈیٹر مقرر کیا "اودھ پنچ" کے علاوہ کوئی قابل ذکر مزاحیہ اخبار اس وقت میدان میں نہ تھا۔ سرپنچ کے تیکھے اور گرما گرم سرورق، کالموں اور کارٹونوں نے بیشتر مزاح نگاروں کو بآسانی اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ شہباز بلند پرواز ظریفؔ لکھنوی، آوارہ حیدرآبادی، اور فرقتؔ کاکوروی وغیرہ نئے اور پرانے نشہ سواد اودھ پنچ سے نکل کر سرپنچ کے ظریفوں کی صف میں شامل ہو گئے۔

"سرپنچ" کی زعفران زار محفل میں ظریفؔ لکھنوی کی شمولیت ایک بزرگ کی شرکت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اودھ پنچ کی طرح یہ سرپنچ کے بھی نورتن ہو گئے پہلے تو

سرپنچ نے ان کا وہ کلام شائع کیا جو کبھی اودھ پنچ کے صفحات پر دھومیں مچا چکا تھا۔ اور پھر ان کا تازہ کلام بھی کلامِ ظریف، مزاحِ ظریف، ظرافتِ ظریف، اور فرمانِ ظریف" کے عنوان سے سرپنچ میں نظر آنے لگا۔ سرپنچ کے وقتی اور ہنگامی موضوعات اور مختلف ادبی مسائل و مباحث میں بھی ان کی تحریریں نظر آنے لگیں۔ علاوہ ازیں ظریف کی نثر کے نمونے بھی سرپنچ کے صفحات پر جگمگانے لگے۔ "بم بہادیو، خودکشی، ذریعہ معاش، مرچوں کی شکایت" کے علاوہ "مشورہ" بھی" سرپنچ ہی میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا یہ شعر اب بھی لطف دے جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

زر کمانا ہو تو لکھ پڑھ کے پلیڈر بن جاؤ
جب وکالت نہ چلے قوم کے لیڈر بن جاؤ

ظریف لکھنوی کا ایسا کلام" سرپنچ کی جلدوں میں اب بھی محفوظ ہے جو ہمیں "دیوان جی" میں نہیں ملتا۔

"سرپنچ" کے نورتن میں ظریف لکھنوی کا نام سرِفہرست ہے ان کے ذکر کے بغیر مزاحیہ ادب کی تاریخ میں "سرپنچ" کا کوئی بھی تذکرہ نامکمل رہے گا۔

"سرپنچ" سالِ نو کے موقع پر "سرپنچ گزٹ" نکالتا تھا جس میں مزاح نگاروں کو باقاعدہ خطابات تقسیم ہوتے تھے۔ اور ان کے انتہائی دلچسپ کارٹون شائع کئے جاتے تھے۔ "سرپنچ گزٹ" نے ظریف لکھنوی کو "ملک الشعرا" کا خطاب دیا تھا شعرائے کرام کے لیے سرپنچ کا یہ سب سے بڑا خطاب تھا۔ اور اسی کے ساتھ ان کا ایک بہت ہی اچھا کارٹون بھی شائع کیا تھا۔ جس میں انھیں سب سے بڑا شاعر دکھایا گیا تھا۔

"سرپنچ" اور اس کے مزاح نگار ظریف کا بڑا احترام کرتے اور انھیں انتہائی عزیز رکھتے تھے۔ مجال نہ تھی کہ کسی طرف سے ان پر شہ پڑ جائے یا کوئی آنکھ دکھا

جائے اس بات کا اندازہ اس طویل اور دلچسپ معرکہ سے ہو سکتا ہے جو ظریف لکھنوی کے سلسلہ میں سرپنچ اور "چوپنچ" میں ہوا تھا۔ یہ معرکہ ۱۹۳۲ء میں چھڑا اور ۳۳ء میں آخیر تک جاری رہا۔ اس قیامت خیز معرکہ میں "سرپنچ" کے ساتھ "ہمدم" "لکھنؤ" "اودھ اخبار" لکھنؤ اور روزنامہ ہند لکھنؤ میں "دو دو باتیں" کے مزاحیہ کالم بھی شریک ہو گئے تھے

ہوا یہ کہ ہفتہ وار اخبار "چوپنچ" کلکتہ کے مدیر عنایت دہلوی پر "سرپنچ" لکھنؤ نے یہ الزام لگایا کہ انھوں نے ظریف لکھنوی کی ایک مشہور زمانہ غزل سرقہ کرکے "چوپنچ" میں اپنے نام سے چھاپ لی۔ اس الزام کا "چوپنچ" نے کچھ سختی کے ساتھ جواب دیا۔ بس پھر کیا تھا "سرپنچ" اخبار کے مدیر شوکت تھانوی کا قلم "چوپنچ" کے لیے وقف ہو گیا اور ایک سال تک بے تکان اس کے لتے لیتا رہا۔ شوکت تھانوی اس دوران "سرپنچ" کے علاوہ "ہمدم" اودھ اخبار اور روزنامہ ہند سے بھی وقتاً فوقتاً وابستہ رہے۔ "روزنامہ ہند" سے مثال کے طور پر "دو دو باتیں" کا اس بحث کے سلسلہ میں ایک نمونہ دیکھئے مدیر سرپنچ نے اس میں بھی کس بُری طرح "چوپنچ" کو گھسیٹا ہے یہی کالم بعد میں "سرپنچ" نے بھی نقل کیا تھا۔

"کلکتہ سے ایک ہفتہ وار پرچہ اخبار "چوپنچ" کے نام سے جاری ہے اور خدا جانے کیوں جاری ہے معلوم نہیں وہ کون لوگ ہیں جو اس اخبار کے ناظرین کہلانے کی تذلیل برداشت کرتے ہیں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کن بد مذاقوں کو اس اخبار کا مذاق پسند ہے کہنے کو تو یہ ایک مزاحیہ اخبار ہے لیکن اس کا مزاح دراصل مزاح کی توہین ہے۔ یکہ والوں والا گندہ مذاق اور منہ چڑھانے والی ظرافت اس نام و نہاد ظریف اخبار کی خصوصیات ہیں اور اخباری دنیا میں اس کو وہی درجہ حاصل ہے جو ہندستان میں اچھوت اقوام کو

حاصل ہے حال ہی میں ہمارے مقامی معاصر "سرپنچ" نے اس اخبار کا چور لے پر بھانڈا پھوڑا ہے اور جس بری طرح اس کا شیرازہ بکھرا ہے وہ واقعی ایک عبرتناک سبق ہے۔

قصہ اصل میں یہ ہے کہ ہندوستان کے مایۂ ناز ظریف شاعر اور سرپنچ کے نورتن سید مقبول حسین صاحب ظریفؔ لکھنوی نے ایک بلند پایہ غزل اب سے بہت پہلے ایک مشاعرے کے لئے فرمائی تھی۔ جو مشاعرے میں پڑھنے کے بعد لکھنؤ کے بچہ بچہ کی زبان پر آگئی، اور ہندوستان کے بیشتر اخبارات نے اس غزل کو نقل کیا، لیکن اب وہی غزل اخبار "چوپخ" میں مدیر "چوپخ" جناب عنایتؔ دہلوی کے نام نامی اسم گرامی کے ساتھ چھپی نظر آرہی ہے اور بقول معاصر "سرپنچ" کے ہم خود حیران ہیں کہ اس غزل کے جملہ حقوق ملکیت کس طرح یکایک ظریفؔ صاحب سے عنایتؔ صاحب کی طرف منتقل ہوگئے۔ ہم نے نہ تو آج تک ایسا عظیم الشان توارد دیکھا ہے کہ پوری کی پوری غزل لڑ جائے، نہ ہم نے ایسا بے نظیر سرقہ دیکھا ہے کہ کسی زندہ مشہور شاعر کا کلام چرا کر شائع کر دیا جائے اور نہ یہ دیدہ دلیری ہماری نظروں سے گزری ہے کہ چوری کی غزل جلی حروف کے ساتھ اپنے ہی اخبار کے سرورق پر اس طرح چھاپی جائے کہ گویا آپ ہی کی تو ہے۔ ؏

چہ دلاور ست دزدے کہ بکف چراغ دارد

ظریفؔ صاحب کے متذکرہ بالا غزل کے کچھ شعر ہم کو بھی یاد ہیں جو حال ہی میں چوری کی گئی اور جس کا چور معاصر "سرپنچ" نے لکھنؤ سے بیٹھے ہی بیٹھے کلکتہ میں گرفتار کیا ہے ملاحظہ فرمایئے وہ اشعار ؎

وحشت میں ہر ایک نقشہ الٹا نظر آتا ہے	مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے
اعجاز تخیل ہے بے وصل کے عاشق کو	آغوش میں جاناں کی بو نظر آتا ہے

سب دیکھ کے کہتے ہیں داڑھی کو تری واعظ
وہ قصرِ تقدس کا چھجا نظر آتا ہے

یہ غزل اس قدر مشہور ہے کہ کچھ دنوں تک لکھنؤ والوں کا قومی ترانہ رہ چکی ہے اور اب بھی لوگ اس کو گنگناتے پھرتے ہیں اس کے علاوہ اخبارات نے اس کو اس قدر شہرت دی ہے کہ دیکھیے "جناب چونچ" تک بلکہ اِن کی بیاض بلکہ ان کے اخبار تک اس کی رسائی ہوگئی بہر حال غزل کی مقبولیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا یہ تو حال ہے اس اخبار کے ایڈیٹر صاحب کا پھر بھلا اخبار کی کیا حالت ہوسکتی ہے۔ ع

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

معاصر سرپنچ نے یہ خوب کہا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ایڈیٹر صاحب موصوف کسی صاحب سے اپنے لیے نظمیں اور غزلیں کہلواتے ہیں اور ان "ستم ظریف صاحب" ہی کی یہ شرارت ہے کہ جناب ظریف کی مطبوعہ غزل اٹھا کر عنایت صاحب کو دے دی، ان بیچاروں کو کیا خبر تھی کہ یہ غزل کیسی ہے وہ تو یہی جانتے تھے کہ میں نے غزل خریدی ہے لہٰذا یہ نئی ہوگی لیکن اتفاق سے وہ نکل گئی سکنڈ ہینڈ اور سکنڈ ہینڈ بھی نہیں، بلکہ چوری کا مال، اور اب جناب والا پکڑے گئے ہیں اور باز پرس ہو رہی ہے تو اب آپ کو ہوش آیا ہوگا کہ کرایہ کا ٹٹو کس قدر ناقابلِ اعتبار ہوتا ہے۔ ع

دیکھو انہیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

اسی کے ساتھ "سرپنچ نے اپنے ایک ہنگامہ خیز اداریہ میں "چونچ" کے مدیر کی خبر لیتے ہوئے لکھا کہ

"سرپنچ" نے کلکتہ کے نام نہاد جیتھیڑے چونچ کی جو مسلسل اور متواتر مرمت کی تھی اس کو از روئے قاعدہ اس قدر جلد اُسے نہ بھولنا چاہیئے تھا۔ ۔ ۔ ۔ جب تک سرپنچ کا غیظ و غضب قیامت نگرانِ

حضرات پر ٹوٹتا رہا اس وقت تک تو آپ خدا جانے ..... کہاں پناہ لیتے رہے

رہے ...... ہم کو ہر طرف سے سمجھایا گیا اور ہر ایک نے ہم کو خاموش

رکھنے کی کوشش کی اور ہم نے اپنے کو عرصہ تک "برہنہ پا" رکھنا

مناسب نہ سمجھا اور ان ذات شریف کے سر سے یہ بلا ڈال دی"

"سرپنچ" میں خطوط کی اشاعت کے لئے "سرپنچ ڈاک" کے عنوان سے جو ڈاکخانہ

کھلا ہوا تھا اُس میں اس کے مزاح نگاروں اور پڑھنے والوں نے پہلے تو "چوپنچ" پر

پنجے جھاڑ کر خوب ہی خوب حملے کئے مگر بعد میں ترس کھا کر اس کو معاف کر دینے کی

سفارشیں بھی ہونے لگیں ایک صاحب لکھتے ہیں۔

مائی ڈیر شوکت صاحب،

للّٰہ اب "چوپنچ" کی جان چھوڑ دو ۔ کہیں پھڑ پھڑا کر نہ جائے

بےزبان جانور کو ستانا اچھا نہیں ہے ۔

رفیع احمد نگینہ

رفیع احمد صاحب نگینہ تسلیم۔ "چوپنچ" کو چھوڑ دوں بہت اچھا مگر

وہ تو ہفتہ یا منگل کے روز صدقہ کر کے چھوڑا جا سکتا ہے بہر حال آپ کے

علاوہ دوسرے احباب کی بھی یہی رائے ہے کہ "سرپنچ" کو "چوپنچ" کے

لئے چڑی مار نہ بننا چاہیئے اور ہم خود بھی یہی سوچتے ہیں کہ اب پنجرہ

کی کھڑکی کھول دی جائے ۔ ش ۔ ت ۔

اداریوں اور مزاحیہ کالموں میں گولہ باری کے ساتھ ساتھ مدیر چوپنچ پر انتہائی

مضحکہ کارٹونوں کے ذریعہ چاند ماری جاری تھی کہ مدیر ماہنامہ نیرنگ خیال لاہور

حکیم محمد یوسف حسین نے پہلے "چوپنچ" والوں کو کلکتہ جا کر نرم اور ٹھنڈا کیا اسکے

بعد لکھنؤ پہونچ کر "سرپنچ" کو اس سلسلے کے ختم کرنے پر مجبور کر دیا۔ آخیر میں ظریف لکھنوی

نے اس معرکہ کو ختم کرنے کے لیے ایک خط "سرپنچ" کو لکھا جس میں انھوں نے بتایا کہ پہلے یہ غزل ایک مشاعرے میں پڑھے جانے کے بعد "اودھ پنچ" میں شائع ہوئی تھی۔ اور وہیں سے دوسرے اخبارات اور رسائل نے نقل کیا تھا۔

مختصر یہ کہ ظریفؔ اور "سرپنچ" کا چولی دامن کا ساتھ ہے ان کا بیشتر نمائندہ کلام آج بھی "سرپنچ" کی جلدوں میں محفوظ ہے۔ "سرپنچ" کے مطالعہ کے بغیر ظریفؔ کے کلام کا ذمہ دارانہ انتخاب اور اُن کے ساتھ انصاف ممکن نہیں اس لیے ظریف کے ساتھ "سرپنچ" کی وابستگی تشنگانِ شوق کے لیے اہم بھی ہے اور ضروری بھی۔

الجھپٹ ★ اردو کا ایک قلمی ظریف اخبار

مفت نظر ہوں میری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشم خریدار پہ احسان میرا

الجھپٹ

ماہ اپریل
سنہ ۱۹۱۲ء

مولوی
عبدالعلی شوق سندیلوی

جلد اول
نمبر اول

نثر

نظم

شوق سندیلوی کے قلمی ظریف اخبار کے پہلے شمارے کے سرورق کو آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ یہ وہی شوق سندیلوی ہیں۔ جنہوں نے اپنی ایک غزل ہندوستان کے تمام بڑے بڑے اساتذہ کو اصلاح کے لیے بھیجی تھی اور جب سب کی اصلاحیں موصول ہوگئیں تو انہوں نے ان سب کو کتابی شکل میں "اصلاحِ سخن" کے نام سے شائع کروا دیا تھا۔ عرصہ تک ان اصلاحوں اور اصلاحوں کے ساتھ بھیجے گئے اساتذہ کے دلچسپ خطوط کی بدولت دُنیائے شعر و ادب میں خاصے ہنگامے رہے تھے۔

کاروبارِ شعر و ادب میں "اصلاحِ سخن" خاصے کی چیز اس لئے بھی ہے کہ اس میں جہاں ایک ہی شعر پر ہر طرح کی اصلاحیں اور قیمتی مشورے شامل ہیں وہاں شکووں شکایتوں اور فرمائشوں کا ایک ایسا دفتر بھی ہے جس سے شاگردی اور اُستادی کے بے لوث اور کاروباری پہلوؤں اور اس کی خوبیوں اور خامیوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

شوق سندیلوی کی اہمیت لیکن محض "اصلاحِ سخن" تک محدود نہیں بلکہ ان کی حیثیت نصف صدی قبل کے ممتاز اردو مزاح نگاری کی ہے۔ شوق "اودھ پنچ" کے دوسرے دور "فتنہ عطر فتنہ" اور "سرپنچ" کے لکھاڑوں میں سے تھے۔ شوق سندیلوی کو طنزیہ و مزاحیہ نظم و نثر پر پوری قدرت تھی۔

یہاں شوق سندیلوی کے مزاحیہ قلمی ظریف اخبار "الجھیٹ" کے بارے میں کچھ کہنا مقصود ہے۔

"الجھیٹ" ۱۹۱۲ء کی ایک فائیل استاذی ڈاکٹر پروفیسر نورالحسن ہاشمی صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی نے مجھے عنایت کی ہے۔ یہ ایک دلچسپ نخہ ہے جس کے بارے میں اس سے قبل میری نظر سے کوئی تبصرہ یا تذکرہ نہیں گذرا۔

"الجھیٹ" کا پہلا شمارہ ۵ اپریل ۱۹۱۱ء کو شائع ہوا تھا۔ اس پر کہیں قیمت درج نہیں ہے۔ مگر پیشانی کے شعر سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ "سرمۂ مفت نظر" تھا اور

اس کے بارہ صفحات جب ہاتھ سے لکھ لئے جاتے تو اس کی اشاعت اس اہتمام سے ہوتی کہ کتابت کے بعد پرچہ پریس جانے کے بجائے احباب اور شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ جاتا اسی طرح ہاتھوں ہاتھ آخیر میں اڈیٹر کے پاس واپس آجاتا۔ کہنے کو تو اس کے بارہ صفحات تھے۔ مگر اس میں کبھی چھ صفحے لکھے ہوئے ہوتے اور چھ سادے اور کبھی آٹھ، کبھی دس، اور کبھی پورے ۱۲۔ غالباً اس کا کوئی خاص اصول نہ تھا۔

"الجھپٹ" ہر ماہ کی ۱۰، ۲۰، اور ۳۰ تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ گویا یہ دس روزہ تھا۔

"یہ پرچہ ہر انگریزی مہینے کی ۱۰، ۲۰، ۳۰ تاریخ کو سندیلہ سے شائع ہوتا ہے"

(سرورق "الجھپٹ" شمارہ سوم)

"الجھپٹ" کے مطالعے سے دو باتیں صاف ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اول یہ کہ شوق کا یہ کارنامہ ان کے بچپن اور طالب علمی کے زمانے کا ہے دوم پرچہ نکالتے کے وقت ان کے پیش نظر "اودھ پنچ" اور "فتنہ عطر فتنہ" کی صحافت اور تہذیب تھی۔ مثلاً دیکھئے:۔

لوکل خبریں

"معلوم ہوا ہے کہ چند وجوہات سے اسعد
علی صاحب قدوائی کا نام جبلی ہائی اسکول سے
چرچ مشن ہائی اسکول میں منتقل ہونے والا ہے"

"ہم کو نہایت افسوس ہے کہ ہمارے معزز دوست
وحید احمد صاحب کے بائیں پیر میں دانہ نکل
آیا ہے جس سے ان کو چلنے میں سخت تکلیف

ہوتی ہے۔ خدا ان کو جلد شفا عطا فرمائے
اور نیز ان کو امتحان میں کامیاب کرے“

”ہم کو دلی افسوس ہے کہ چودھری محمد
اکبر حسین صاحب بیمار ہوگئے ہیں ہوناتشریف لیے جاتے
ہیں۔۔۔۔۔۔۔ ہم دُعا کرتے ہیں کہ
خداوندکریم ان کو ڈپٹیشن میں کامیاب کرے“

(”الجھپٹ“ شمارہ دوم)

”اودھ پنچ“ کی طرح ”الجھپٹ“ کے بھی ۱۲ ہی صفحات ہوتے تھے۔ مگر اس کا سائز کتابی بلکہ ڈیمائی تھا۔ اس کی نظم و نثر مسلسل مضامین، اشتہارات کا انداز اور خبروں کے تراشے، سب کا رنگ ڈھنگ اودھ پنچ والا ہے۔ لوکل اور تار کی خبریں، مختصر مضامین، نظموں اور غزلوں کے انتخاب میں وہی ”فتنہ“ والا انداز جھلکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود ”الجھپٹ“ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے اپنا انداز سب سے الگ رکھا۔ یہ رنگ خوب چمکا ”الجھپٹ“ کی مقبولیت کے ساتھ شائقین کا اصرار بڑھا کہ ”الجھپٹ“ کی کئی کاپیاں تیار کرائی جائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچ سکے۔

”الجھپٹ کی کئی کاپیاں تیار کرائی جایا کریں۔ تاکہ عام لوگ
اس سے مستفید ہوں۔“
جوالا پرشاد

ممتاز معاصرین کا تعاون

”الجھپٹ“ کو مرزا محمد ہادی رسوا، پنڈت جوالا پرشاد برق، علی حیدر نظم طباطبائی اکبر الٰہ آبادی، اور امتیاز علی سہیل ایڈیٹر ”الخیر“ جیسے ممتاز معاصرین کا قلمی تعاون

حاصل تھا۔

"الجھپٹ" کے اداریے دل چسپ اور مختصر ہوتے تھے۔ ان میں کسی نہ کسی علمی، ادبی یا سیاسی مسئلہ پر اظہار خیال کیا جاتا یا توجہ دلائی جاتی۔ ورنہ رسالے اور اس کی پالیسی کے بارے میں بتایا جاتا :۔

"الجھپٹ" صلح کل کے زیور سے ایک دُلہن کی طرح آراستہ ہو کر نکلے گا۔ اس کی مشاطگی اعلیٰ درجہ کے سحر نگار انشار پردازوں کی نظم و نثر کی تحویل میں ہوگی ...."

("الجھپٹ" شمارہ اول ایڈیٹوریل ص۳)

"الجھپٹ" اخلاقی، تمدنی، نیچرل نظم و نثر کے مضامین ہمیشہ شایع کرے گا۔"

("الجھپٹ" شمارہ ۲)

میری تحویل میں "الجھپٹ" کی جو فائیل ہے اس میں اس کا پہلا، دوسرا، تیسرا اور سولھواں شمارہ شامل ہے پہلے تین شمارے اپریل کے ہیں۔ اور سولھواں شمارہ ماہ جون کا ہے۔ مگر یہ سب پرچے ۱۹۱۲ء کے ہیں۔ تیسرے شمارے میں رسالے کے نام (الجھپٹ) پر "ط" کے ساتھ "ت" کے نقطوں کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اور سولھویں شمارے میں اضافہ یوں ہے۔ "الجھپٹ" مگر اس تبدیلی میں خاص بات یہ ہے کہ زائد نقطے اصل خط اور روشنائی کے لحاظ سے مختلف معلوم ہوتے ہیں ممکن ہے کہ یہ اضافہ اس کے پڑھنے والوں نے بعد میں کیا ہو۔

"الجھپٹ" میں سب سے دلچسپ چیز اس کے اشتہار ہوتے تھے۔ جو آخری صفحے پر انگریزی میں درج ہوتے تھے۔ مثلاً ایک اشتہار کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے :۔

"سندیلے کے ایک ۱۹ سالہ نوجوان تعلقدار کے لئے ایک حسین وجمیل، تعلیم یافتہ بیوی کی ضرورت ہے ...... ایڈیٹر کے

پاس مع تصویر کے درخواستیں بھیجی جائیں۔"

مرزا رسوا کا مضمون

"الجھپٹ" میں مضمون نگاری کا وہی معیار رہا جو ہمیں "اودھ پنچ" میں ملتا ہے۔ اس کے پہلے شمارے میں مرزا محمد ہادی رسوا کا ایک مضمون "ذہنی ترقی کے لئے بے کتاب کا سبق" شامل ہے۔ یہ بھی دیکھئے:۔

"ذہنی ترقی کے لئے بے کتاب کا سبق"

مکالمہ

"استاد:۔ لفظ کو سن کے یا کسی جگہ لکھا ہوا دیکھ کے اس کے معنی کیوں یاد آجاتے ہیں؟

سعید:۔ اس لئے کہ اس لفظ کے وہی معنی ہیں۔ مگر بعض معنی نہیں یاد آتے

استاد:۔ کیوں نہیں یاد آتے؟

سعید:۔ یاد نہیں ہوتے یا ہم نے ان کو یاد نہیں کیا ہوتا۔ یعنی اچھی طرح رٹا نہیں ہوتا۔

استاد:۔ یہ تم غیر زبانوں[1] لفظوں[2] ذکر کرتے ہو۔ مثلاً انگریزی۔ مگر تم اپنی زبان کے ہزاروں لفظوں کو نہیں بھول جاتے، جن کو تم نے کبھی نہیں پڑھا؟

سعید:۔ بچپن سے سنتے سنتے یاد ہو گئیں[3]۔

استاد:۔ مگر قرآن شریف کی آئتیں اور سورے اور ان میں جو الفاظ ہیں ان کو تم بچپن سے سنتے رہے ہو۔ ان باتوں کے معنی تم کو کیوں یاد نہیں؟

سعید:۔ وہ تو کبھی بتائے نہیں گئے۔

ستاد:۔ لیکن ہزاروں نظمیں اپنی زبان کی جو تمہیں یاد ہیں۔ ان کے معنی کب بتایئے گئے تھے؟

سعید:۔ ہم بچپنے سے ان چیزوں کو دیکھتے آئے ہیں اور ان کے نام بھی سنتے آئے ہیں۔

---

[1] کے۔ [2] کا۔ [3] ہو گئے۔

اُستاد:- ہاں تو یوں کہو کہ کسی چیز کو دیکھا اور اس کا نام سُنا یہ دو واقعے ایک وقت میں ہوئے۔ اس لئے جب ایک ہوتا ہے اور دوسرا نہیں ہوتا۔ تو وہ یاد آجاتا ہے۔ یا یوں کہو کہ قاعدہ اقتران سے ساتھی کو ساتھی یاد آجاتا ہے۔"

مرزا محمد ہادی رسوا بی۔اے۔"

منشی جوالا پرشاد برق کی "چند تجاویز" محمد امین سندیلوی کی "نصیحت" شوق سندیلوی کا "ایک عظیم الشان جلسہ کی تحریک"۔ "ایک پھول کی سرگذشت" "تان سین" "قدر نعمت بعدِ زوال" اور "دل بے قرار" چودھری محمد عبدالرشید کی "خوشخبری" اور غلام حسین کا "مذاق"۔ "الجھپٹ" کی مضمون نگاری کا ایک دلچسپ متوازن اور شائستہ معیار پیش کرتے ہیں۔

"فتنہ عطر فتنہ" کی طرح "الجھپٹ" میں بھی نثر کے مقابلے میں نظم زیادہ ہوتی تھی۔

"الجھپٹ" کے شعراء

"الجھپٹ" کے شعراء کی فہرست بھی دیکھئے:-

شوقؔ سندیلوی۔ عبدالمجید حمیدؔ، شوکتؔ، علی حید، طباطبائی، احسان، چودھری محمد عبدالرشید، نظیر حسن فراقؔ، سہیلؔ، امیرؔ، امتیاز علی سہیل، غوث، نظیر احمد، شیدا سندیلوی، نظرؔ لکھنوی۔

ایک آدھ نمونے، الجھپٹ کی شاعری کے بھی دیکھئے:-

مدت ہوئی کہ ان سے نہ نامہ پیام ہے
اس دوستی کو بندہ کا فرشی سلام ہے ——— (شوقؔ)

میں ہی تصویر نہیں دیکھتا تیری اکثر
حضرتِ شیخ بھی مانوس ہیں مخفی مخفی ——— (جوالا پرشاد برقؔ)

"اَلجھپٹ" میں "لوکل" اور "تاریخی خبریں" کے علاوہ دوسرے اخبارات کی خبروں کے تراشے بھی ہوتے تھے۔ "الجھپٹ" کے یہ کالم بھی "اودھ پنچ" اور "فتنہ" کی طرح دلچسپ ہوتے تھے۔

"الجھپٹ" کی خبروں سے یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اودھ کے مُردم خیز خطہ سندیلہ سے ایک اور مزاحیہ اخبار بھی نکلتا تھا۔ جس کا نام "الخپ" تھا اور جس کو امتیاز علی سہیل نکالتے تھے۔

ایڈیٹر "الخپ" کا کلام شوق کے پرچے میں شائع ہوتا تھا اور ان کے سندیلے میں رہنے اور سندیلے سے "الخپ" کے اجرا کے علاوہ اس بارے میں کوئی دوسری تفصیل نہیں معلوم ہوئی۔

"الجھپٹ" سے جہاں اس زمانے کی علمی، ادبی اور ثقافتی رفتار کے بارے میں دلچسپ اندازہ ہوتا ہے۔ وہاں بعض اہم باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً اکبر الہ آبادی سندیلہ میں بھی قیام کرتے تھے۔ راجہ درگا پرشاد کی گاڑی الٹنے اور سر میں چوٹ آنے کا واقعہ، ایڈیٹر "الخپ" چرچ مشن ہائی اسکول میں مدرس تھے۔ منشی سید التفات رسول خان صاحب تعلقدار جلال پور کے یہاں ایک ایسا مشاعرہ ہر سال ہوتا تھا جس میں ہندوستان بھر کے مشاہیر شعرا ہفتوں قیام کرتے تھے۔

"الجھپٹ" کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ بعد میں یہ کب تک نکلتا رہا۔ آیا یہ ایک محض دلچسپ تجربہ یا وقتی شوق کی حیثیت رکھتا تھا یا اس نے آگے چل کر ایک مستقل حیثیت اختیار کر لی تھی۔ ممکن ہے کہ سندیلہ میں اس کے بعد کی بھی فائلیں ہوں۔ جب کہ موجودہ فائیل سے صرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کم از کم سنہ ۱۹۱۲ء میں یہ پابندی سے نکلتا تھا۔ اس کے پڑھنے والوں کا ایک حلقہ تھا جس میں یہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔

اُردو کی مزاحیہ صحافت میں اس کی حیثیت اس وجہ سے غالباً منفرد ہے۔ کہ میری اب تک کی معلومات کے مطابق یہ اُردو کا منفرد ظریف قلمی اخبار ہے جو معیار اور مذاق میں کسی بھی چھاپے کے مزاحیہ اخبار سے پیچھے نہیں۔

شوکت تھانوی بحیثیت کالم نگار

کالم نویس طنزیہ، مزاحیہ صحافت کے آئینے میں روزمرہ کی رواں دواں اہم جواں زندگی کے معمولی سے معمولی حادثے سے لے کر عظیم ترین واقعہ کے نازک پہلوؤں تک کو اس حسن و خوبی کے ساتھ پیش کر دیتا ہے کہ تبسم زیر لب یا بے اختیار قہقہے کے ساتھ ہی قاری کو اپنی خامی اور کھوکھلے پن کا احساس ہو جاتا ہے اس کی مسکراہٹ یا ہنسی سنجیدہ فکر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ زندگی کی ناہمواری اور اپنی خوش فہمیوں پر نظرثانی کرنے کی اس کوشش اور جذبہ کی جس قدر بھی ستائش کی جائے کم ہے۔

اُردو کی مزاحیہ صحافت کا آغاز ۱۸۴۵ء میں رام پور کے رسالہ "مذاق" سے ہوا، اس کی دیکھا دیکھی بنارس پنچ، 'فرحت الاخبار' مدراس پنچ، اور روہیلکھنڈ گزٹ بھی اسی روش پر چل نکلے۔

مگر باقاعدہ ابتدا، کا سہرا منشی سجاد حسین کے سر بندھتا ہے منشی صاحب نے ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے "لندن" پنچ کے خطوط پر" اودھ پنچ" کا اجرا کیا۔

"اودھ پنچ" ہماری صحافت کا سنہری دور ہے۔ "اودھ پنچ" کے شہ سواروں کے توپ خانے کی زد سے سیاست، معاشرت، تہذیب، اخلاق، ادب اور زندگی کی کوئی بھی بے ضابطگی اور بد عنوانی نہ بچ سکی۔ زوال آمادہ معاشرے کی غلامانہ ذہنیت، نوکرشاہی، اودھ کی لٹی ہوئی نوابی، لیموں نچوڑ مصاحب، ماضی پرست، برطانوی سامراج، بانکے، طوائفیں، عیاشی، نسلی امتیاز اور گوراشاہی کے خلاف بڑی جرأت

بے باکی اور فرزانگی کے ساتھ اودھ پنچ آتش فشانی کرتا رہا۔ اودھ پنچ کی یہ خدمت ہمارے قومی ادب کا ایک اہم جزو ہے۔

اودھ پنچ کے نکلتے ہی اس کی تقلید میں ملک کے گوشے گوشے سے بے شمار پنچ نکل پڑے جن میں لاہور پنچ، "اپنچ . جالندھر پنچ، پنجاب پنچ، سرپنچ، بنگال پنچ، باد آدم پنچ، دہلی پنچ، راجپوتانہ پنچ، بنارس پنچ، کرناٹک پنچ، کیٹیر پنچ، جھجر پنچ، کرڈا پنچ دکن پنچ، قنوج پنچ، آگرہ پنچ، فتح گڈھ پنچ، صدر پنچ، فیروزپور پنچ، اور برار پنچ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔"

اودھ پنچ اور اس کے معاصر پنچوں کی مقبولیت نے رفتہ رفتہ سنجیدہ اخباروں کے دامن میں پناہ لی اور مزاحیہ کالم کی صورت میں جلوہ گر ہوئے۔

کالم نویسی کی روایت منشی سجاد حسین، مولانا محمد علی جوہر، خواجہ حسن نظامی ظفر علی خاں، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا عبدالماجد دریا بادی اور چراغ حسن حسرت سے ہوتی ہوئی شوکت تھانوی تک پہونچی ہے۔

مولانا عبدالمجید سالک کا زمیندار لاہور میں "افکار و حوادث" مستقل کالم نویسی کی طرف پہلا فنی اقدام تھا اور "ہمدم" "د" اودھ" اخبار لکھنؤ میں شوکت تھانوی کی "دو دو باتیں" اور جنگ کراچی و راولپنڈی میں "وغیرہ وغیرہ" "اور پہاڑ تلے" اس ابتدا کی انتہا ہے۔

یہ خیال غلط ہے کہ شوکت تھانوی کا مزاحیہ کالم صرف اس وجہ سے مقبول تھا کہ دوسرے مزاح نگار نہ تھے۔ یا کالم اور کالم نویس نہ تھے۔ شوکت تھانوی کا دور مزاحیہ ادب نہیں بلکہ مزاحیہ صحافت کا دور ہے۔ اردو کے مشہور اخباری کالم ہمیشہ ممتاز مزاح نگاروں ہی نے لکھے ہیں شوکت تھانوی سے قبل منشی سجاد حسین مولانا محمد علی جوہر اور ان کے زمانے میں خواجہ حسن نظامی، ظفر علی خاں، مولانا عبدالمجید سالک، چراغ

حسن حسرت اور مولانا عبدالماجد دریا بادی جیسے جلیل القدر صحافیوں کے علاوہ بھی ان کے بے شمار معاصرین ان گنت کالم لکھ رہے تھے جن میں "وغیر وغیر" "سچی باتیں" "پیاز کے چھلکے" "گلوریاں" "حرف وحکایت" "حوادث وافکار" "بت شکن" "سر راہے" "سنگ وخشت" "گر تو برا نہ ملنے" "شیشہ وتیشہ" "تیر ونشتر" "نمکدان" "موج در موج" "نقش ونگار" باغ و بہار، ادھر ادھر، بر سبیل تذکرہ، جام بکف، کہنے کی بات، آج کی باتیں، تلخ وشیریں، قیل وقال، آنکھیں میری باقی اُن کا، پھلجڑیاں، دلِ ناداں، نیک وبد، ہیر نے کہا، تازیانے، کف گلفروش، تفنن برطرف، مکاہات، مطائبات، دامِ خیال، چٹکیاں، گد گدیاں، کرنیں اور سائے، ذکر وفکر، جام جہاں نما، چھیڑ چھاڑ اور ہماری باتیں، جیسے بے شمار اخبارات اور رسائل کے کالم بلند وپست ظرافت وکثافت سے کام لیتے نظر آتے ہیں۔ غرض بیشتر مزاح نگار اپنے فن کا اظہار کالم نگاری کے پردے میں کر رہے ہیں۔ مگر ان میں سے چند کے سوا شوکت تھانوی کے سامنے کسی کا چراغ نہ جل سکا بلکہ بیشتر تو ان کے کالم کی ہمیشہ خوشہ چینی ہی کرتے رہے۔

ان کی اس مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ کالم نویسی میں وہی مزاح نگار کامیاب ہو سکتا ہے جس میں طباعی اور حاضر دماغی کے ساتھ ساتھ مسائل کا ادراک، وقت، زمانے اور قوم کے مزاج سے واقفیت ہو۔ وسیع علمی معلومات اور پاکیزہ مذاق رکھتا ہو تاکہ ہنسی ہنسی میں بات کہہ اور منوا سکے۔ شوکت تھانوی کی حاضر دماغی، طباعی، خوش مزاجی اور مزاج دانی کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ شوکت تھانوی محض کالم نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے نہیں آتے بلکہ ان کی پہلو دار شخصیت میں بڑی ہی ہمہ گیری اور تنوع ہے۔ وہ بیک وقت کالم نگار، مزاح نگار، افسانہ نگار، پیروڈی گو شاعر مزاحیہ شاعر، ڈرامہ نویس، صحافی، ریڈیو آرٹسٹ، فلم آرٹسٹ اور ایک باغ و بہار انسان کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

شوکت تھانوی بہارِ بے خزاں کا ایک ایسا لہکتا اور مہکتا ہوا پھول ہیں جس میں ہر رنگ اور خوشبو ہے۔ وہ ایک ایسے منسوڑ ہیں جو گھر کی چہار دیواری اور ڈرائنگ روم سے کسی قیمت پر باہر نہیں آتے۔ ان کے خانہ زاد قصے، لطیفے، چٹکلے، قہقہے اور باتیں ہیں۔ زمانے کی فکروں سے دم بھر کے لئے آزاد کر دیتی ہیں جس سے گھریلو زندگی اور بزم بے تکلف کی کشش ہمارے لئے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

"سودیشی ریل"، تعزیت، ۱۹۵۷ء کا مشاعرہ، پرابلم، کرکٹ، بومبئی میل ایسٹ، بابو، وکیل اور گنبد میں مینار جیسے مضامین، شیش محل کے خلکے تعبیر طلب اور افسانہ ماد غیرہ جیسے افسانے ما بدولت اور شوکتیات، کچھ یادیں، کچھ باتیں جیسی خود نوشت سوانح، بڑھبس، خوانخواستہ اور سسرال جیسی ناولیں تصنیف کرنے اور قاضی جی اور منشی جی جیسے لازوال مزاحیہ کردار تخلیق کرنے والا قلم جب کالم نگاری پر آتا ہے تو اپنے عہد کے مقبول ترین کالموں سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ شوکت تھانوی کی بے پناہ فطری صلاحیتیں ظرافت، شگفتگی، بے ساختگی، ندرت بیان، شوخی زبان ان کے کالم کی مقبولیت کا باعث ہیں۔ ان کی کوثر و تسنیم میں دھلی دھلائی، رواں دواں نثر، الفاظ اور خیالات پر قدرت اور ہر بات میں نکتہ فہمی کی دوسری مثال نہیں ملتی۔

شوکت تھانوی کی زعفران زار ظرافت کے پردے میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی واقعہ، مسئلہ، حادثہ یا بات ہوتی ہے جس کی آڑ میں اخلاقی، سیاسی یا سماجی بدعنوانی پر طنز ہوتا ہے۔

شوکت تھانوی کے کالموں کے چند عنوانات ملاحظہ فرمایئے

"انگریزی سیاست، مسلم لیگ، کانگریس، خاکسار، خدائی فوجدار، ملکہ حسن بیگم صاحبہ، مٹھو بیٹے، تحاس، محرم، لکھنؤ، نوابین اودھ، مصاحبین، افیم چی، شاعر مشاعرے، دوست، پڑوسی، ٹیڈی، ٹیڈی ازم، بشیر ساربان، چین، نیرنگی زمانہ،

نیا زمانہ، مہاجر، گرانی، چور بازاری، رشوت، مکانوں کی قلت، لیڈری، وزارتیں، افواہیں، لسانی مسائل، سفید پوشی، تعصب، عیاشی، دفتری گورکھ دھندے، سڑکوں کے نام، سیاح، غذائی آمیزش، آزاد شاعری، نصابی مسائل، ریلوں کے حادثے، اردو تیزگام، بیس۔ تاریخی عمارتیں، سڑکیں، انجمن سازی، خوشامد پسندی، جاہ پرستی، بے انصافی، عدم مساوات، ٹریفک کے حادثے، کاروبار شعر و ادب، بین الاقوامی سیاست، گداگری۔ اقتدار کی ہوس، مذہبیات، منصوبہ بندی کا پورٹ، خبروں کے حاشیئے، بال کی کھال، فحش ادب، سودے بازی، رنگے سیار، انجمن اقوام عالمگیر مسائل، تہوار، امتحانات، ادر بو ہیں، وغیرہ ان عنوانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی ذہنی سطح میں بہت وسعت اور معلومات میں تنوع ہے۔ زبان کی ادبیت اور شیرینی، سلاست و لطافت کی مدد سے اپنے مخصوص طرز کے ذریعہ قاری کے اچھے جذبات بیدار کرنے میں پوری طور پر کامیاب رہتے ہیں۔

"شوکت تھانوی" ہمدم" "تحریک" "اودھ اخبار" "سرپنچ" "طوفان" "ہند" "حق" اور "جنگ" میں مزاحیہ کالم لکھتے تھے۔

شوکت تھانوی کی کالم نگاری کا آغاز روزنامہ ہمدم سے ہوتا ہے۔ جس میں وہ "دو دو باتیں" لکھتے تھے۔ یہی سلسلہ اودھ اخبار "سرپنچ" "طوفان" اور "ہند" میں بھی انھوں نے جاری رکھا۔

"دو دو باتیں" کا یادگار معرکہ سیماب اکبرآبادی کے "تاج" ہفتہ وار سے ہوا تھا۔ جس میں سیماب نے اپنے شاگرد خواجہ ستارالحسن جمیل مدیر "فرشتہ" ہفتہ دار کو بھی شہ دے کر آگے بڑھا دیا۔ شوکت تھانوی نے "فرشتہ" کے لیے لکھا کہ "فرشتہ" تو فرشتہ اس کے معلم الملکوت تک کے فرشتوں کو کیا اس کی خبر نہیں ہے کہ "ہمدم" روزانہ اخبار ہے اور یہ گنڈے دار چھپنے والے ہفتہ وار اخبار

اس کی روزانہ کی چوٹوں کا اگر ہفتہ میں ایک بار جواب بھی دے سکیں تو بھی ہفتہ کے باقی دن سہلاتے گذر جایا کریں گے۔

بات یہاں تک بڑھی کہ سیماب نے تلملاکر شوکت تھانوی کو "باتونی" اور شیطان کی اولاد" قرار دیا اور شوکت تھانوی نے ان کے مصرعہ کی رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ع

سیماب حقیقت میں فطرت کا تمسخر ہے

ان کو "فطرت کا تمسخر" تسلیم کرکے بحث ختم کردی۔ دوسرا یادگار معرکہ بوڑھے "اودھ پنچ" اور شہ زور سرپنچ میں ہوا۔ اس میں بھی شوکت تھانوی غالب رہے اس معرکہ سے لطف اٹھانے کے لئے اودھ پنچ اور سرپنچ کی پرانی فائیلوں کا مطالعہ ضروری ہے۔ سرپنچ میں شوکت تھانوی کے قلم کی دھاک سے میدان صحافت کے بڑے بڑے سورما چوکنا رہنے لگے کہ معلوم نہیں کب کس کی خبر لے لی جائے۔

روزنامہ "تحریک" میں شوکت تھانوی نے "لالہ زار" کے نام سے فکاہی کالم لکھنا شروع کیا، اس کا ایک تاریخی فقرہ آپ بھی سنئے اور لطف اٹھایئے۔

"مولانا شوکت علی اپنے چھوٹے بھائی محمد علی کا شاہکار ہیں" روزنامہ "حق" میں شوکت تھانوی "حق و باطل" کے عنوان سے مزاحیہ کالم لکھتے تھے۔

بعد میں شوکت تھانوی نے "جنگ" میں "وغیرہ وغیرہ" اور اس کے بعد "پہاڑ تلے" کا کالم سنبھالا۔

"وغیرہ وغیرہ" میں "تیز گام" پر لکھتے ہیں..... "تیز گام" بے طعام، خدا اس ٹرین سے سفر کی اپنے ہر نیک بندے کو توفیق عطا فرمائے، مگر ان نیک بندوں کے ان اعمال کو بخش دے جن کی پاداش میں اس ٹرین کا کھانا ان کو کھانا پڑتا ہے اس "عذاب خوردنی" سے وہ عاقبت اندیش بچ جاتے ہیں جو ناشتہ ساتھ لے کر

چلتے ہیں...... ورنہ..... چائے کا پہلا ہی گھونٹ پی کر یہ محسوس ہوا کہ حقے کے پانی میں کالی مرچیں حل کرنے کے بعد دودھ اور شکر ملا دی گئی ہے....... بیرے سے لاکھ لاکھ پوچھا کہ یہ کس جڑی بوٹی کی چائے ہے اور کن امراض کے لئے مفید ہے مگر وہ اس خاندانی نسخہ کا بھید کھولنے کو تیار نہ ہوا اس لئے کہ اس قسم کے نسخے لوگ اپنے ساتھ قبر میں لے جاتے ہیں..... میرے سامنے سب سے پہلے "سوپ" آیا معلوم ہوتا تھا کہ کتھے کے پانی پر چونے کی کچھ چھینٹیں پڑی ہوئی ہیں۔ اعتراض اس لئے نہ کیا کہ بیرا گنوار نہ سمجھے۔ سوپ کا پہلا ہی چمچہ پی کر معلوم ہوا کہ یہ دراصل کتھے کا پانی نہ تھا بلکہ جس پانی میں گوشت دھویا گیا ہے اسی کو گرم کر لیا گیا ہے۔ بہ مشکل اس گھونٹ کو حلق سے اتار کر سوپ ہٹا دیا۔ اس کے بعد مرغی کے کچھ ٹکڑے گاجر کے چند قتلوں اور آلو کی چند قاشوں کے ساتھ پیراکی کی مشق کرتے ہوئے سامنے آئے۔ مرغی کے ٹکڑے اس قدر سخت تھے کہ چھری جواب دے گئی۔ دانت بیکار ثابت ہوئے .... بہر حال ہم نے یہ بوٹیاں اپنے پس ماندگان کے لئے چھوڑ دیں۔ مچھلی آئی تو اس قدر باسی تھی کہ یقین ہو گیا کہ یہ طوفانِ نوح کے موقع پر پکڑی گئی تھی اور آج ہمارے معدے کو تاریخی اہمیت دینے کے لئے ہمارے سامنے پیش ہوئی ہیں۔"

"پہاڑ تلے" کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے اور اجازت دیجئے۔

ایک صاحب اپنے ایک دوست کی وفات حسرت آیات کی خبر سن کر رو پیٹ کر صبر کر چکے اور ان کے لئے دعائے مغفرت کر چکے تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک دن وہی مرحوم ہٹے کٹے، زندہ سلامت چلے آرہے ہیں اور حسبِ معمول جوشِ محبت سے ان کو گلے لگانے کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان صاحب نے چار قدم پیچھے ہٹ کر جلدی جلدی کچھ آیات پڑھ کر اپنے اوپر دم کیا، ان دوست کے پیروں پر نظر ڈالی کہ پنجے آگے کی طرف ہیں یا ایڑی آگے ہے۔ اور پنجے پیچھے۔ ان کی آواز۔

پر غور سے کان دھرے کہ یہ حضرت ناک سے تو نہیں بول رہے ہیں۔ اور جب ہر طرح سے اطمینان کر لیا۔ تو خود ان سے دریافت کیا کہ شاید آپ کا تو انتقال ہو چکا تھا۔ پھر کیسے زحمت فرمائی؟ تو ان حضرت نے ہنس کر کہا۔ میں اس افواہ کی تردید کے لیے اصالتاً حاضر ہوا ہوں اور میری زندگی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ میں خود آپ کے سامنے حاضر ہوں اور اپنی ہی زبان سے اس افواہ کی تردید کر رہا ہوں"۔ اس پر بھی ان کو کسی طرح اطمینان نہ ہوا اور انھوں نے کہا کہ "یہ تو درست ہے کہ میں آپکو زندہ سلامت اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہوں مگر آپ کے انتقال کی جس شخص نے خبر دی ہے وہ آپ سے زیادہ قابلِ اعتماد اور آپ سے زیادہ سچا ہے لہذا میں اس کے مقابلہ میں آپ کی شہادت کو کیونکر قابلِ اعتبار سمجھوں۔"

طنزیاتِ مانپوری

اردو ادب کے آسمان ظرافت پر "اودھ پنچ" کی قوس و قزح میں اپنیچ کا رنگ خاصہ شوخ اور گہرا تھا. منشی سجاد حسین کے نورتنوں کی طرح سید رحیم الدین استھانوی کے گرد بھی (دہقانی) جیسے، شمع ظرافت کے پروانوں کا ہجوم ہوگیا تھا. زندہ دلان عظیم آباد کی اس محفل میں، مانپوری کا چراغ سب سے زیادہ روشن تھا. اس چراغ سے بعد میں جو چراغ جلے ان میں علی اکبر قاصد، واہی، نذر امام اور رماہ میرخاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں.

طنزیات اور مطائبات مانپوری کے مطالعہ سے اور ان کے ذاتی و شخصی حالات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک خود دار انسان ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے وطن پرست بھی تھے. ان کے مضامین سے نہ صرف ان کی ظرافت کی شریعت سے آگاہی ہو جاتی ہے بلکہ ان کی اپنیچ سے ذہنی وابستگی کا بھی پتہ چلتا ہے. ان کا مسلک بھی وہی نظر آتا ہے جو "اودھ پنچ" اور اس کے نورتنوں کا تھا. وہ بھی انگریز کی غلامی، مغرب کی اندھی تقلید اور مشرق کے انداز تغافل سے بیزار نظر آتے ہیں. انھیں بھی مشرقیت اور کانگریس عزیز نہیں. سیاسی ہتھکنڈوں یورشوں اور بدلتے ہوئے حالات پر ان کی بھی ناقدانہ نظر ہے.

مقدمہ طنزیات مانپوری کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ کلاسیکی ادب کے علاوہ عربی فارسی کے بھی وہ اچھے نباض تھے اور اساتذہ کے کلام کا انھوں نے بغور مطالعہ کیا تھا.

"گلستان مانپوری" اور فرہنگہ مانپوری' خاصے کی چیزیں ہیں. ان میں ہم کو ان کی دقت پسند طبیعت کا انوکھا پن، جدت و ندرت، حسین و نادر پیروڈی کی صورت

میں ملتا ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہم کو چہرہ ان کا اور عکس دوسروں کے نظر آتے ہیں۔ عکس در آئینے کے اس حسن تضاد کا مواد انھوں نے خود اپنے مضامین کے اقتباسات سے حاصل کیا ہے۔ یہاں وہ ہم کو ایک کامیاب طنز نگار سے زیادہ ریاضی داں نظر آتے ہیں جس کی کوئی بھی صاحبِ دل داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اردو ادب میں حدیث دل کی تفسیروں کی طرح پیروڈی کی بھی بہت بہتات ہے مگر اچھے ناول کی طرح ایسی پیروڈی بھی ہمارے یہاں اگر عنقا نہیں تو نکیاب ضرور ہیں۔ ملا رموزی کی گلابی اردو" شفیق الرحمان کی تو زک نادری کنھیا لال کا" سلیم اور انارکلی" فرقت کا کوروی کا مداوا" اور شوکت تھانوی کا " بار خاطر" کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر پیروڈی نہیں ملتی، اس فہرست میں" گلستان مانپوری "کا بھی اضافہ کر لیجیے۔ اردو پیروڈی کا کوئی بھی تذکرہ اس کے بغیر نامکمل سمجھا جائے گا۔ اس کے اقتباسات کچھ ادھر سے کچھ ادھر سے آپ بھی ملاحظہ فرمایئے اور اس کی ذہانت کی داد دیجئے۔

باب اول" سیرت بادشاہان "

جو ناسمجھ سرکار کے خلاف زہر اگلتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اگر خدا نہ خواستہ سرکار نہ رہی تو پھر ہندوستانیوں کو سوراج کون دے گا۔ (ص ۲۲۵)

باب دوم "در اخلاق درویشاں "

اب میں بقیہ پیسے وصول کرنے کے چکر میں پڑتا تو ریل چھوٹ جاتی مجبوراً ......

...... میں نے کہا جاؤ باقی تمہارا انعام ــ پھر فوراً خیال آیا کہ اس قدر پریشان کرنے کے بعد انعام دے کر مفت پیسے برباد کرنے ہیں اس لئے فوراً خیرات کے مد میں دینے کی نیت کر لی۔ (ص ۳۱۲)

باب سوم" در فضیلت قناعت "

گارڈ صاحب!" مجھے کسی طرح گاڑی میں بٹھا دیجئے۔ اور نہیں تو کم از کم پارسل

والے ہی ڈبے میں تول کر رکھ ...... دیجئے جو محصول واجب ہو لے لیجیے"۔ (ص ۲۱۳)

اب چہارم، در فوائد، خاموشی،

ہمیں کیا معلوم کہ پاگل خانے کی جگہ آپ ہمیں بہار اڑیسہ اسمبلی میں لے آئے بھی بگڑ یا خفا ہو، ہمیں تو وہی ...... سماں رنج چپ بھی رہو ...... بات کہنے کی نہیں۔ (ص ۱۲۲)

باب پنجم "در عشق و جوانی"

ماما کی دستیابی اور وہ بھی ان شرائط کے ساتھ کہ سن چالیس سے کم نہ ہو، شوخ و وضعدار نہ ہو، پھر شوہر والی بھی ہو (ص ۱۱)

باب ششم "در ضعف و پیری"

ہم نے جل کر کہا "اس قدر تکلف کی کیا ضرورت ہے، افطار میں ماگو دانہ، شب کو بارلی واٹر اور سحری میں ملّین فوڈ کافی ہوگی۔ (ص ۷۷)

باب ہفتم "در تاثیر ترتیب"

ڈاکٹر نے اطمینان دلایا کہ "یہ پاگل ہیں! اس کو صرف صاحب بننے کا مالیخولیا ہے۔ (جدال سعدی ص ۱۱۹)

"میر کلو کی گواہی۔"

وکیل:۔ مرحوم کس بیماری سے مرے تھے؟

میر کلو:۔ ہائے رونا تو اسی کا ہے کسی کو اصل مرض کا پتہ ہی نہیں لگا سچی بات تو یہ ہے کہ ان کو موت کی بیماری تھی۔" (ص ۸)

باب ہشتم "در آداب صحبت۔"

میرے دل میں صاحب لوگوں کی قدر اور بھی بڑھ گئی کہ یہ لوگ کس قدر خلیق ہوتے ہیں کہ کوٹھی سے نکلوانے کے وقت گردن میں ہاتھ دینے کے بجائے اخلاقاً ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہیں۔" (ص ۶۴)

گلستان مانپوری کی طرح فرہنگِ مانپوری میں ان کی قیادت پسند طبیعت کا ایک عجوبہ ہے۔ نواب سید محمد آزاد کی طرح انھوں نے بھی الفاظ کو نئے اور دلچسپ معنی پہنائے ہیں مشت نمونہ از خروارے۔

"فرہنگ مانپوری"

۳۔ (ص۔ ۱۵۳)۔ دُم چھلّا۔ شادی کے بعد دعوت ولیمہ۔

۱۰۔ (ص۔ ۲۶۴) حج قیامت۔ حج الکفن

"میر کلّو کی گواہی" لکھ کر مانپوری نے بقائے دوام کے دربار میں جگہ خاص کر لی اس کے بعد اگر وہ ایک حرف بھی نہ لکھتے تب بھی تاریخ میں ان کی جگہ محفوظ رہتی۔

مرزا ظاہر دار بیگ خوجی چچا چھکّن مرزا جی، قاضی جی، شیطان بڈی مرزا۔ ابجد بیگ وددد بیگ اور میر کلّو ہمارے ادب کے مزاحیہ کردار ہیں۔

مانپوری نے "میر کلو" ایک جیتا جاگتا کردار پیش کیا ہے۔ ہر عدالت کو میر کلو سے روزآنہ سابقہ پڑتا ہے عدالتیں اور پیشہ ور گواہ کہاں نہیں ہوتے ظاہر دار بیگ خوجی اور چچا چھکن کی طرح میر کلو بھی مکمّل ترین مزاحیہ کردار ہے۔ میر کلو کی سنجیدگی، بردباری حاضر جوابی، ذہانت اور فطانت اس کو مزاحیہ کردار بنا دیتی ہے۔ نہ وہ خوجی اور قاضی جی کی طرح مسخرہ بنتا ہے اور نہ اُسے قاری و سامع کو ہنسانے کے لئے کرتب دکھلانے پڑتے ہیں۔ میر کلو کے سامنے آتے ہی ہمارے ذہن میں پیشہ ور گواہ کا نقشہ کھنچ جاتا ہے یہ مانپوری کا شاہکار ہے۔ جس خوبصورتی اور حسن کے ساتھ انھوں نے اسکو نبھایا ہے۔ اس کی مثال ہمارے ادب کے مزاحیہ کرداروں میں بہت کم ملے گی۔

"میر کلو کی گواہی" طنز و ظرافت، فن و ادب کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ ظاہر دار بیگ ابن الوقت، چچا چھکّن اور خوجی کی طرح یہ بھی ہمارے اعلیٰ کلاسیکی مزاحیہ ادب کی ایک شاندار میراث ہے۔

عدالت میں گواہی کی پکار ہو رہی ہے مگر گواہ کا دور دور پتہ نہیں مقدمہ خارج نہ ہو جائے اس خوف سے مجبوراً وکیل صاحب کو گواہی کے مشہور ماہر اور پیشہ ور گواہوں کے سزا یافتہ استاد میر کلو کی خدمات حاصل کرنی پڑتی ہیں اور وہ ان کو بغیر کچھ بتائے دروغ حلفی کی پیشگی فیس دے کر گواہی کے لئے پیش کر دیتے ہیں میر صاحب ایک دم مقدمہ کی سماعت سے ناواقف، فریق مخالف کا وکیل میر کلو سے واقف وکیل صاحب چھوٹتے ہی دریافت کرتے ہیں۔

وکیل :- میر کلو آپ کبھی جیل کی بھی سیر کر چکے ہیں ؟

میر کلو :- آجکل کون ایسا خادم قوم ہے جو جیل نہ ہو آیا ہو۔

وکیل :- آپ کو ملک کی کس خدمت کے صلے میں یہ فخر حاصل کرنے کا موقع ملا ؟

میر کلو :- وہی قانون شکنی۔

وکیل :- کس قانون کو توڑنے کی خدمت آپ نے اپنے ذمہ لی تھی -؟

میر کلو :- گاندھی جی نے نمک کے قانون توڑنے کا بیڑہ اٹھایا تھا بعض لیڈروں نے قانون جنگلات کی خلاف ورزی کی ذمہ داری لی۔ میرے خیال میں سب سے زیادہ ضرورت قانونِ شہادت کی اصلاح کی ہے اس لئے میں نے اسی کو منتخب کیا۔

وکیل :- اے حضور جاننے کی بھی ایک ہی کہی۔ خدا مرحوم کو جنت نصیب کرے ہم دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ نہ مجھے ان کے بغیر آرام نہ ان کو میرے دیکھے بغیر چین۔

وکیل :- ان کی کیا عمر تھی -؟

میر کلو :- یہی تیس اور ساٹھ کے درمیان۔

وکیل :- تیس اور ساٹھ کے درمیان کہنے سے کام نہیں چلے گا صاف کہئے وہ بوڑھے تھے یا جوان --؟

میر کلو :- عمر کے لحاظ سے زیادہ بوڑھے نہیں تھے مگر اکثر بیمار رہنے کی وجہ سے

بوڑھے معلوم ہوتے تھے۔

وکیل :- بال سفید تھے یا سیاہ ؟

میر کلو :- نزلے کی وجہ سے بال سفید ہوگئے تھے لیکن خضاب لگانے کے بعد جوان معلوم ہوتے تھے۔

وکیل :- رنگ گورا تھا یا کالا ؟

میر کلو :- نہایت ہی گورے چٹے آدمی تھے لیکن دق کی بیماری کی وجہ سے رنگ کچھ سانولا سا ہوگیا تھا۔

وکیل :- لانبے تھے یا ناٹے ؟

میر کلو :- قد تو لانبا تھا لیکن کمر جھک جانے کی وجہ سے ناٹے معلوم ہوتے تھے۔

وکیل :- مرحوم داڑھی بھی رکھتے تھے یا نہیں ؟

میر کلو :- عجب آزاد وضع اور رندانہ مشرب کے آدمی تھے۔ جی میں آیا تو چار ابرو کا صفایا کر دیا، کبھی داڑھی بڑھائی تو خواجہ خضر کو بھی مات کر دیا۔

"آخر وکیل مخالف جھنجھلا کر میر کلو سے کہتا ہے زیادہ ادھر ادھر کی نہ ہانکیں ہر بات کا صرف ہاں یا نہیں میں جواب دیں۔

وکیل :- مرحوم رہتے کہاں تھے ؟

میر کلو :- جی ہاں۔

وکیل :- ہاں نہیں کیا سوال کا جواب دیجئے۔

میر کلو :- آپ ہی نے کہا تھا کہ جواب میں صرف ہاں یا نہیں کہو۔

وکیل :- میرا یہ مطلب نہیں تھا اچھا بتایئے وہ کہاں رہتے تھے ؟

میر کلو :- اپنے مکان میں ؟

وکیل :- آپے سے باہر ہوتے ہوئے، لاحول ولا قوۃ عجب سمجھ ہے میرا مطلب یہ ہے

کہ مرحوم شہر میں رہتے تھے یا دیہات میں۔

میر کلو:- دونوں جگہ، کبھی شہر میں کبھی دیہات میں۔

وکیل:- دیہات میں ان کا مکان کس رخ پر تھا۔

میر کلو:- شہر میں رہنے والوں کا دیہات میں اکثر تیر بہک جاتا ہے وہاں جب گیا مجھے سمت کا صحیح پتہ نہ لگا۔

وکیل:- انھوں نے یہ روپے کس کام کے لئے لئے تھے؟

میر کلو:- اپنی ضرورت کیلئے۔

وکیل:- کوئی خاص ضرورت آپڑی تھی؟

میر کلو:- ان کے نزدیک خاص اور عام دونوں ضرورتیں ایک ہی تھیں؟

وکیل:- انھوں نے روپے کب لئے تھے؟

میر کلو:- جب ضرورت پڑی۔

وکیل:- کتنے دن ہوئے؟

میر کلو:- تین سو ساٹھ دن کا ایک سال ہوتا ہے اب حساب کرنا اور جوڑ کرنا کہ سب ملاکر کتنے دن ہوئے ذرا مشکل ہے۔

وکیل:- مرحوم کی تحریر تو آپ پہچانتے ہی ہونگے؟

میر کلو:- یہی تو ایک کمال مرحوم میں تھا۔ نہایت خوش نویس ہفت قلم تھے ہمیشہ مختلف شان سے لکھا کرتے تھے قلم پر اتنا اختیار تھا کہ ان کا ایک خط کبھی دوسرے سے نہیں ملا۔

وکیل:- مرحوم کا انتقال کس بیماری میں ہوا تھا؟

میر کلو:- رونی صورت بناکر ہائے رونا تو اسی کا ہے کہ ان کے علاج میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا حکیم، وید، ڈاکٹر سب ہی کا علاج کیا۔ مگر کسی کو اصل مرض کا پتہ ہی

نہیں لگا۔ کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ، "چوں قضا آید طبیب ابلہ شود" جناب وکیل صاحب سچی بات تو یہ ہے کہ ان کو موت کی بیماری تھی۔

اسی میں چار بج گئے، اجلاس اگلے دن کے لیے ملتوی ہوگیا اور دوسرے روز موکل کو اپنے گواہ پیش کرنے کا موقع مل گیا۔ قصہ مختصر میر کلو نے ثابت کر دیا کہ گواہ کو سچے سے زیادہ ذہین اور حاضر جواب ہونے کی ضرورت ہے۔"

ماما کی مصیبت میری اسیری وہاں میں ان پاگل خانے کی سیر کرایہ کی ٹم ٹم اشاہی کی فضول خرچیاں، ایڈوانس وائف اور میونسپل الکشن، مانپوری کے بہت اچھے مضامین ہیں۔ اس میں انھوں نے جن مسائل پر قلم اٹھایا ہے ان کا حق ادا کر دیا ہے۔

اگر ماما نہ ہو تو گھر گرہستی کی گاڑی رُک جائے، بات بیوی اور شوہر کے تعلقات تک آجائے۔ بیوی اگر میکے نہ جائے تو روٹھ تو سکتی ہے۔ باورچی خانہ ویران ہوجائے اچھے بھلے آدمی کو ہوٹل میں کھانا کھانا پڑے۔ احباب کی دعوتیں منسوخ کرنا پڑیں۔ یہ وہ حالات و واقعات ہیں جو نہ صرف عالمگیر ہیں بلکہ روزمرہ کی زندگی میں آئے دن اس قسم کے حادثات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ماما کا ملنا اس کے نہ ملنے سے بھی بڑی مصیبت ہے۔ کسی وقت بھی گھر میں دنگل ہو سکتا ہے۔ چوری ہو سکتی ہے۔ گھر والی کا اعتبار اٹھ سکتا ہے۔ غرض مانپوری نے بڑے خوشگوار پیرایۂ ظرافت میں اس بات کے دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ روزمرہ کے مسائل میں گہری دلچسپی، مشاہدے اور حسن بیان نے ایک عجب لطف پیدا کر دیا ہے۔ اس بات سے شاید آپ بھی اتفاق کریں کہ "ماماؤں کی قلت اور ان کے رویہ نے ایک عالمگیر مصیبت کی صورت اختیار کر لی ہے۔" ماماؤں کی مصیبت سے غرض نجات ممکن نہیں۔ خواہ ماما دستیاب ہو یا نہ ہو یا یوں سمجھیے کہ مصیبت کے لیے ماما کی شرط نہیں۔

ہمارے ملکی نظام انصاف میں سامراج کے زمانہ میں اسیری کا ناقص رواج

زور پڑ گیا۔ ہر نتھو، بدھو، خیرو کو اسیسری کرنے کے لئے، گھر سے پکڑ کر بلوایا جاتا تھا۔ حاکم جس پر مہربان ہو جاتا یا جس کی گھر بیٹھے شامت آتی وہ اسیسر قرار دے دیا جاتا تھا۔ اسیسر عموماً اس قسم کے لوگ بنائے جاتے تھے جو اپنی ذاتی رائے، انفرادیت، شخصیت، تعلیم قانونی نکات، سوجھ بوجھ اور قوت فیصلہ سے یکسر محروم ہوا کرتے تھے۔ ہوتا وہی تھا جو جج صاحبان چاہتے تھے۔ اس لئے فاضل جج کی رائے اور فیصلہ ہمیشہ محفوظ ہوا کرتا تھا۔ دلچسپ پہلو اس بات کا یہ ہے کہ یہ اسیسر صاحبان پھانسی، حبس دوام، سزا و جرمانے دینے کے بارے میں اپنی رائے دیتے تھے۔ اور ان کی رائے کا بہت کچھ ہونے والے فیصلے سے تعلق ہوا کرتا تھا۔ قومی حکومت نے جو اصلاحات کیں ان میں ایک قابلِ قدر کارنامہ یہ بھی انجام دیا کہ عدالتی نظام میں سے اسیسری کا سلسلہ ختم کر دیا اس طریقے کے موقوف ہونے کا عدلیہ پر بہت اچھا اثر پڑا۔

مانپوری کے زمانہ میں اسیسر کا وجود اگرچہ تھا۔ انھوں نے جس طرح سے اس ادارے کا مطالعہ کیا ہے اور جس انداز سے اسکی خامیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ نہ صرف وہ دلچسپ ہے بلکہ خاصہ سبق آموز بھی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسیسر بننے کے لئے کیسی کیسی دوڑ دھوپ کی جاتی۔ خوشامدیں کی جاتی تھیں، لمبے چوڑے چندے دیئے جاتے تھے۔ پھر اس زمانے کی ایک یہ بھی کہاوت تھی کہ جس کو کچھ نہ ملے گا اسے اسیسری تو مل ہی جائے گی۔ اکسیر کا عہدہ حاصل ہونے کے بعد عدالت کے عملے (فاضل جج سے لیکر چپراسی تک) کے ہاتھوں ان کی کیا درگت نہیں بنتی تھی۔ اور خود اس عہدۂ جلیلہ پر ہونے کے بعد اکسیر دوسروں پر کس طرح رعب جماتے ہیں۔

ایک فاضل اکسیر کا حلیہ خود آپ مانپوری کی زبانی سنئے:۔

(ایک پنڈت جی مرزئی پہنے سر پر پھچے دار پگڑی رکھے ہاتھ میں دوا کی شیشی لئے جج صاحب سے فرما رہے ہیں) سرکار مہر اسیسری سے رہائی کر دی جائے ہمرا پیٹ بہت

پرات ہے آپئے ڈاکٹر اُوحیدگن سے دوائی لے آدیں .... "

جج صاحب آپ نے کیا رائے قائم کی ؟ گلٹی ناٹ گلٹی ؟

اسیسر ۱۔ سرکار کی کرپا سے ہم اگلٹی اور پلیگ نا ہے۔

دوسرا اسیسر (دریافت کرنے پر) حضور ملزم کو پھانسی کی ایسی سخت سزا دی جائے کہ کافی تنبیہہ ہو جائے اور وہ پھر آئندہ ایسا جرم کرنے کی ہمت نہ کرے۔

زمانے کے سرد و گرم کے ساتھ مانپوری بھی اسیسری کا مزہ چکھے ہوئے تھے اور خود بقول ان کے "کبھی وہ بھی اسیسرہ چکے تھے" اپنے زمانۂ اسیسری کے تاثرات یوں بیان فرماتے ہیں ؎

میں بے قصور کٹھرے میں بند دن بھر ہوں

اسیسر ہوں میں خدا جانے یا اسیر ہوں

بلایا مجھ کو پکڑ دا کے گھر سے جب پایا

میں سی کلاس کا مندرجۂ رجسٹر ہوں

بلا معاوضہ رہتا ہوں خاطر اجلاس

کسی وکیل کا بگڑا ہوا مقدر ہوں

نہ میری رائے کی عزت نہ خود میری عزت

اور اس پہ ناز ہے ہم کو کہ میں ممبر ہوں

کمزور طبیعت اور ڈرپوک مزاج حضرات کہاں نہیں ہوتے۔ ایسے لوگوں میں اتنی سکت کہاں کہ کبھی خود کسی فیصلے پر پہونچ سکیں خود کوئی قدم اٹھا ئیں، جرات رندانہ کے ساتھ ایسے اشخاص ہمیشہ ہر بات مانیں گے بھی اور ماننے کے لئے ہی چیز ان کے لئے ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ باغباں اور صیاد کو بیک وقت خوش رکھنے کی خاطر یہ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں اور کچھ بھی کر گذر سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا مانپوری نے نہ صرف بہت سخت مذاق اڑایا ہے

بلکہ ان پر شدید طنز بھی کیے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس قسم کے مرنجاں مرنج بزرگ موقع مصلحت دیکھ کر مولویوں میں مولوی اور رند مشربوں میں ساقیٔ محفل بن جاتے ہیں ایسے حاشیہ نشینوں کو سرشار نے لیمو نچوڑ کے نام سے یاد کیا ہے۔ ایسے ہی ایک لیموں نچوڑ اور ایک رئیس کے مکالمات وہ اپنے اوپر ڈھال کر یوں بیان فرماتے ہیں:۔

"ایک سراپا جہل مرکب رئیس نے جوش سیاستدانی میں مجھ سے فرمایا" وزیر اعظم.... ...نے گاندھی جی کی بات نہ مان کر دوسری غلطی کی"۔ میں نے کہا۔

"بیشک حضور نے صحیح فرمایا ان دونوں کو اتنی سمجھ ہوتی تو یہ لیڈر اور وزیر اعظم ہی ہو کر کیوں رہ جاتے کوئی رئیس نہ ہوتے؟ وزیر اعظم ہونے سے کیا ہوتا ہے، آخر ہیں تو مزدور جماعت کے آدمی، خاندانی رئیس ہوئے بغیر کہیں دور اندیشی آسکتی ہے۔ حضور کو اپنی ریاست کے کاموں سے فرصت ہی نہیں ہوتی ورنہ یہ گڑبڑ کاہے کو ہوتی"؟ رئیس نے خوش ہو کر فرمایا۔

"آج تم کھانا میرے ساتھ کھانا۔"

مصنف کے دو دوستوں میں آپس میں چل گئی۔ موصوف میں اتنی ہمت کہاں کہ سچ بول کر مصلحت سے کنارہ کشی اختیار کرتے جس سے ملاقات ہو جاتی تعریف کرتے جو نہ ہوتا اس کی دستور زمانہ کے مطابق مذمت کرتے۔" ایک دن ان کی موجودگی میں دونوں بھڑ گئے بقول ان کے اس وقت ان کی وہی حیثیت تھی جو مہاسبھا اور مسلمانوں کے درمیان مہاتما جی کی ہوا کرتی تھی۔" جس کا انجام یہ ہوا کہ "دونوں بگڑ کر یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ "یہی ہم دونوں کو لڑواتا ہے۔"

حاشیہ برداروں اور خوشامد خوروں پر شائد اس سے زیادہ ستھرا طنز ممکن نہیں۔ ہاں میں ہاں ملانے والوں کی سمندِ ناز پر یہ دونوں دراصل ایک اور تازیانہ ہیں۔ مانپوری کی حیثیت ایک تماشائی کی سی ہے۔ مگر ان کو تماشہ بننے پر بھی انکار نہیں

دوسروں کے سلسلہ میں وہ اپنا مذاق اڑانے سے بھی نہیں چوکتے ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہمارے سامنے ناصح، محتسب یا نقاد کے روپ میں نہیں آتے۔ ان کو یہ فریب اور چال سے بھری دنیا، اس کی اسمبلیاں۔ اس کے مغرب زدہ ہندوستانی عظمت کے غم میں گھل کر دبلے و بیمار رہنے والے سیاسی لیڈر، کالے گورے کی تخصیص برتنے والے، ہاں میں ہاں ملانے والے برہنگی عریانیت، صاحبیت و اقتدار کا مظاہرہ کرنے والے، خطاب اور اعزاز کی خاطر یاران وطن سے بے وفائی کرنے والے، کوٹھا بدر مجنوں، شاعر، محبت آشرم کے والنٹیر غرض ایک سرے سے پاگل نظر آتے ہیں۔ مگر پاگل خانے کی سیر کرنے کے بعد ان کو سخت مایوسی ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس سے بڑے بڑے پاگل تو وہ پاگل خانے کے باہر دیکھ چکے تھے۔

"شادی کی فضول خرچیاں" ظاہر ہے کون پسند کرتا ہے۔ اور یہ بھی طے ہے کہ نہ ہونا چاہیئے مگر ہوتی ہیں ماچپوری نے ان لوگوں پر اس میں بڑا شدید حملہ کیا ہے جو دوسروں کو سمجھاتے ہیں مگر جب اپنی باری آتی ہے تو اسی کام میں سب سے آگے آگے ہوتے ہیں۔ باجا گاجا، آتشبازی، عورتوں کی فرمائش، برائیوں کا مستقل قیام ان کے غمزے منگنی میں آنیوالی چیزیں، ہاتھی گھوڑے قالین، عطردان، گلاب پاش، کپڑے زیور مٹھائیاں مہمانوں کا روٹھنا، ہنگامے کرنا، ناچ گانا، رسمیں، دستور، شگون، بری۔ خلعت جلوس بارات، سہرہ، جہیز، نیک جوگ، بے لطف تجسس، عورتوں کے چوچلے، ولیمہ کے بعد مہمانوں، براتیوں اور اصحاب کی شکائتیں۔ جو سامان کرایہ یا منگنی پر آیا تھا اس کا ٹوٹنا چوری ہونا، کھونا، یا بدل جانا۔ ڈوم، بھانڈ، کشمیری، خفگی جھگڑے، جرمانے، مہاجن کا سود، ان سب مہملات پر غیر ملکی کس طرح ہنستے ہیں اور ہمارے بارے میں کس طرح سوچتے ہیں؟ ماچپوری کا بیدار ذہن نہ صرف ان فضولیات پر طنز کرتا ہے جو قوم کی جڑیں کھوکھلی کئے ڈال رہی ہیں بلکہ اس میں بھی ہمارے لئے ہنسنے ہنسانے کا سامان پیدا کرتا ہے۔

ماچپوری کے زمانہ میں زیادہ اور آج کل کم یہ بدعت پائی جاتی کہ لوگ شادی شدہ

ہونے کے باوجود ذہنی عیاشی اور وابستگی کے لئے اگر میم نہیں لاپاتے تو کسی نہ کسی طوائف یا آوارہ خاتون سے "ایڈیشنل وائف" کے جیسے تعلقات قائم کرلیتے. ان لوگوں کو دوسروں کی بیویاں اور بازار کے کھانے پسند تھے. انھوں نے اس مسئلے کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ اٹھایا اور اس کے انجام و عبرتناک اختتام سے آگاہ کیا ہے۔

میونسپل الکشن میں امیدواری، اس کی ذلتیں، ان کے کرتوت ان سب پر مانپوری نے بہت اچھی روشنی ڈالی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس جمہوری نظام میں جو کچھ ہوتا وہ عام شہری اور اس کے حقوق کیلئے کسقدر سنگین خطرہ ہے۔

میرا روزہ، نیک آشرم، سکنڈ ہینڈ موٹر، ہاتھی، کرایہ کی ٹم ٹم، اور شاعری ان کے بہترین طنزیہ و مزاحیہ مضامین میں ہیں۔ یہ سدا بہار مضامین ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

مانپوری کے یہاں ہم کو "دیوانگی" کی سی کیفیت ملتی ہے. در اصل انکے کارناموں کے ایک اچھے انتخاب کی ضرورت ہے تاکہ ان کے آرٹ کی بلندی میں ایک توازن کارفرما ہوسکے. اس اس توازن اعتدال کی کمی کا صرف وہ آشکار ہی نہیں بلکہ ان کا عہد بھی ہے "اودھ پنچ" ہو یا "الپنچ" ہنگامی صحافت نے گرمئ بازار کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس دھوپ چھاؤں میں موسم کا اندازہ آسانی سے نہیں ہو سکتا۔ پنچایتی ہنگاموں میں جماعتی توازن اور اعتدال کی سج دھج کہاں ممکن اسی وجہ سے ان کی مقامیت، ان کا زبان وبیان کے ساتھ عدم تعاون نامانوس الفاظ، فقروں و محاوروں کا بے دھڑک استعمال کھٹکتا ہے گو کہ وہ اپنی جولانی طبع و طنز و مزاح کے دھارے میں سب کچھ بہالے جاتے ہیں. مگر آب رواں کی خنکی شبنم کی تراوٹ اور خندۂ تیغ اصل کے لئے ان کے کسی ذمہ دار انتخاب کی ضرورت ہے. ان سب باتوں سے قطع نظر میں آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں مجھے مانپوری اسلئے پسند ہیں کہ انھوں نے "میر کلو کی گواہی" لکھی ہے۔

پطرس بخاری

پطرس بخاری صف اول کے مزاح نگار تھے۔ ایک بڑا مزاح نگار ہونے کے لئے ایک بڑی شخصیت بھی درکار ہوتی ہے اور پطرس کی شخصیت مسلمہ طور پر عظیم تھی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ پروفیسر، پرنسپل اور ریڈیو ڈائرکٹر جنرل وغیرہ کے عہدوں پر فائز رہے آخر میں اقوام متحدہ میں اسسٹنٹ سکریٹری جنرل کے منصب جلیل کی خدمات انھیں سونپی گئیں۔ وہ جس عہدے پر بھی رہے اس کی وقعت بڑھ گئی اور آخری اعزاز تو اتنا بڑا تھا کہ اب تک بہت کم ایشیائیوں کو نصیب ہوا ہے۔

فرائض منصبی کی مصروفیات نے شعر و ادب کی خدمت کے لیے ان کو کبھی مہلت نہ دی مگر جب بھی ان کو موقع اور وقت ملا انھوں نے اس طرف بھی توجہ دی۔ گو کہ انھوں نے بہت کم لکھا مگر جو کچھ لکھا وہ اول درجہ اور اعلیٰ معیار کا۔

ہمارے ادب میں طنز و مزاح کا سرمایہ محدود ہے۔ باضابطہ اس کا آغاز سوداؔ اور انشاؔ سے ہوتا ہے۔ غالبؔ اس سلسلہ کی اہم کڑی ہیں۔ آگے چل کر سوداؔ اور انشاؔ کی روایات "اودھ پنچ" اور "فتنہ" کے ظریفوں کے تجربے میں آئیں اس میں اکبر و سرشار ممتاز ہیں اس کے بعد کی صف میں فرحت اللہ بیگ، پطرسؔ، رشید احمد صدیقی اور شوکت تھانوی وغیرہ آتے ہیں۔ پطرس کے بارے میں ایک نقاد کا یہ قول مشہور ہے کہ "انھوں نے اپنی ظرافت کا مواد زندوں سے لیا ہے۔" زندوں سے مواد کوئی زندہ دل ہی لے سکتا ہے جس نے زندگی کو محسوس کیا اور برتا ہو۔ جس نے انسانوں میں رہ کر ان کی ذہنی اور عملی حرکات کے ایک ایک پہلو کو ہمدردی سے دیکھا ہو۔ زندگی سے یہ لگاؤ غالبؔ کے بعد پطرسؔ کے یہاں

سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ ایک نے ناکامیوں سے کام لے کر مشکلوں کو آسان کر لیا تھا اور دوسرے کے سر اتنا کام آپڑا کہ نمٹ نہ سکا۔

غالبؔ اور پطرسؔ کا نام میں نے اس وجہ سے ساتھ ساتھ لیا ہے کہ دونوں بلند پایہ مزاح نگار ہیں۔ غالبؔ کو مرنے کی فرصت نہ تھی ان کو جینے کی فرصت نہ مل سکی۔ ایک کو اپنے مزاح نگار ہونے کا علم بھی نہ ہو سکا۔ دوسرے کو لوگوں نے احساس بھی کرا دیا تو کوئی اثر نہ ہوا ایک نے اپنی شخصیت کا اظہار شاعری میں کیا مگر اس کے دامن کو تنگ پا کے خطوط کا سہارا لیا۔ دوسرے نے محض چند مضامین خطوط اور تقاریر پر اکتفا کیا۔ عملی زندگی کی مصروفیات اور ذمہ داریوں نے شخصیت کے ارتقا کے دوسرے راستے ڈھونڈھ لئے۔ تحریر، تقریر، تنظیم میں ضم ہو کر رہ گئی۔ اور ہمارے ہاتھ چند مضامین ہی لگے۔ یہ مضامین کتنے گراں بہا ہیں؟ یہ احساس اب ہوگا۔ اختصار میں پطرس غالب سے بھی آگے بڑھ گئے۔ غالبؔ نے لکھنے پڑھنے کے بعد انتخاب کیا تھا اور انھوں نے انتخاب کر کے لکھا۔ دونوں کا اعجاز ایجاز میں نمایاں ہوا۔

"پطرس کے مضامین کے علاوہ بھی انھوں نے چند مضامیں وقتاً فوقتاً لکھے تھے جو بکھر ہو گئیں۔ انھوں نے ایک دلچسپ تنقیدی مضامین کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا۔ فرضی نام سے اس میں ان کا بہترین مضمون "غنچہ تبسم کے دیباچوں پر ایک نظر" کے عنوان سے تھا۔ اس کے علاوہ "نیاز مندان لاہور" کا سلسلہ بھی پطرس ہی کے قلم کا رہینِ منت ہے۔

انھوں نے بہت کم لکھا ہے۔ لیکن جو کچھ لکھا وہ ظرافت کے بڑے بڑے کارناموں پر بھاری ہے۔ اتنا مختصر رخت سفر لے کر بقائے دوام کی منزل تک پہونچنا بڑی ہمت کی بات ہے۔

ان کے مضامین ایک لطیف مذاقِ زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ ان کی شخصیت میں گہرائی، بے تکلفی اور علمی بصیرت اتنی رچی بسی تھی کہ آورد بھی آمد پیدا کر لیتے تھے۔ چونکہ

طبیعت میں ایک قسم کا اعتدال اور ٹھہراؤ تھا اس لئے ادب کو تفریح کا ذریعہ نہیں بننے دیا. اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ ان کا اصل مقصد تفریح ہرگز نہ تھا۔ وہ اپنی ذات سے بلند ہو کر سوچتے تھے۔ قدرت نے انھیں ایسی غیر معمولی اور سدا بہار طبیعت عطا کی تھی جس کی گیرائی، جزرسی اور ذہانت نے ان کی مزاح نگاری کو ان کا بالکل فطری مشغلہ بنا دیا تھا۔ گویا وہ صرف اسی کام کے لئے بنائے گئے تھے۔ ان کے غیر معمولی مطالعے، مشاہدے، سوجھ بوجھ اور غور و فکر نے ان کے مضامین کی فنی عظمت کا معیار متعین کیا ہے۔

پطرس کے سوچنے کا انداز مزاحیہ تھا۔ وہ ہر چیز کو مزاح کی عینک سے اور ایک مخصوص زاوئے سے دیکھتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ چھوٹی سے چھوٹی اور باریک سے باریک بات میں بھی مزاح کا پہلو نکال لیتے تھے۔ اعتدال و اختصار کے باعث وہ بڑی صنعت کاری کے ساتھ بلا کسی شدت کے ذاتی جذبے سے علیحدہ ہو کر ایک قسم کی تعمیم پیدا کر لیتے تھے ان کے یہاں جذبات نہیں ملتے۔ بظاہر نہ وہ خود ہنستے ہیں اور نہ دوسروں کو ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ وہ اس احساس کو ابھار دیتے ہیں جو قہقہے لگانے پر مجبور کرتا ہے۔ ان کے کرداروں کی حرکات و سکنات، واقعات کا انوکھا پن اپنے فطری تسلسل کے ساتھ اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں خود بخود مزاح کا پہلو نکل آتا ہے۔

ایک بڑے مزاح نگار کی طرح ان کو بھی اپنے اوپر ہنسنے کی پوری قدرت ہے۔ جو اپنے اوپر نہ ہنس سکا۔ اسے دوسروں پر ہنسنے کا حق نہیں پہنچتا۔ وہ ہنستے ہیں۔ مگر ایک تماشائی کی طرح نہیں بلکہ ایک ہمدرد اور دوست کی حیثیت سے۔ برناڈ شا نے کہا تھا۔ سچی بات سب سے زیادہ ظریفانہ ہوتی ہے اور وہ اسی سچی بات کو اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ گرد و پیش کے بیشتر انسانی کوڑ سامنے آجاتے ہیں بلکہ مزاح کی عینک سے دیکھ کر خود بھی لطف اٹھاتے ہیں۔ اور ان کا قاری ماتھے پر شکن ڈالے

یا شرمائے بغیر اپنے عیب ہنسی خوشی دیکھ لیتا ہے۔ جیسے تنہائی میں ہم آپ آئینہ دیکھتے ہیں۔
ان کا ہر خیال مضحکہ خیز ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں دلچسپی کے سامان افراط سے مل جائیں گے۔ واقعات و انداز بیان کی مضحک کیفیات ظرافت کے طوفان کے ساتھ ان کے خیال کی انگلی پکڑ کر ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ یہ روانی اور شگفتگی ان کے معمولی سے معمولی خیال کو بھی بلند سے بلند کردیتی رہیں۔ اس کا سبب ان کا سلیقہ تھا۔ یہ سلیقہ ان کے مزاج کا مزاج ہے
پطرس کے موضوعات بالکل سیدھے سادے اور روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔
لیکن اس سادگی میں بے پناہ سنجیدگی ہے۔ اس سنجیدگی میں ایسی غیر محسوس ذہنی منطق ہے جو بالکل چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے نتائج اخذ کرلیتی ہے۔ یہ واقعات ایسے عام اور روزمرہ کے ہیں۔ جو ہمیشہ پیش آتے ہیں اور آتے رہیں گے۔ اسی وجہ سے ان کو ہمیشہ اسی ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا

پطرس نے مزاح نگاری کے فطری انداز کو اپنی تحریروں میں مغرب کی ساری رعنائیوں اور لطافتوں کے ساتھ سمو لیا ہے۔ اس کا سبب چستی، اختصار، تسلسل اور انتخاب ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کیا لینا چاہیئے اور کیا چھوڑ دینا چاہیئے۔ اس لئے وہ بڑی کامیابی کے ساتھ ہماری زندگی کے پنہاں گوشوں کو اپنی ذہانت اور ظرافت کی چاشنی کی مدد سے روشنی میں لے آتے ہیں۔ مغربی اثر کے تحت خالص اور لطیف ظرافت کی وجہ سے ان کی تحریریں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ اردو ادب میں اس کی مثال شاید مشکل سے ملے۔

مغرب کا اثر ان کے یہاں ایک۔ ایسے عالمگیر رنگ میں ظاہر ہوتا ہے جو ذرا بھی گراں نہیں گزرتا اور نہ ترجمہ یا نقالی معلوم ہوتا ہے

مغربی انداز کی خارجیت، ٹھہراؤ اور اعتدال اُن کے جذبات کو روکے رکھتا ہے۔ یہی آگ ان کے سینے میں دب کر گلزارِ ابراہیم کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے اور ہمارے قلب و نظر کو آزماتی ہے۔

پطرس کی زبان میں بیان کی خوبیاں موجود ہیں۔ سادگی، شگفتگی، آمد، روانی دلچسپی، یہ سب خوبیاں ان کو صاحبِ طرز بنا دیتی ہیں۔ ان کا اسلوبِ زبان و بیان کی لطافتوں سے مالا مال ہے۔ اس میں ظرافت کے لئے نہ وہ الفاظ کے گھروندے بناتے ہیں نہ الفاظ کی چاشنی کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں۔ اس حُسنِ بیان میں ایسی سادگی ہوتی ہے گویا وہ اپنے قاری سے بے تکلف گفتگو کر رہے ہوں۔ اُن کی نظر اس کے دل کی انتہائی گہرائیوں تک اُتر جاتی ہے۔ مشاہدے کی قوت سے وہ عام انسان کی مضحکہ خیز حرکات کو اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں اجاگر کر دیتے ہیں۔ واقعات کے نشیب و فراز سے وہ ایک ماہر نفسیات کی طرح گذر جاتے ہیں اس وجہ سے سیرت و کردار کے ارتقا میں کبھی ان کا نشانہ خطا نہیں ہوتا۔ بالکل معمولی انداز میں چلنا پھرنا۔ اٹھنا، بیٹھنا، حرکات و سکنات، رفتار و گفتار، جلوت و خلوت کے مناظر وہ اپنے مشاہدے کی قوت سے دکھا دیتے ہیں۔ وہ عام کمزوریاں جو ہمارے سب کے اندر موجود ہیں ہمہ وقت ان کے سامنے رہتی ہیں۔ مگر ہماری ان کی روح تک رسائی نہیں ہوتی۔ پطرس کی نظروں سے دیکھ کر ہم اپنی ہی اُن کمزوریوں پر بے اختیار ہنسنے لگتے ہیں

وہ ہم کو پلاٹ کی بھول بھلیوں میں نہیں بھٹکاتے اور نہ اجنبی کرداروں میں گم کر دیتے ہیں بلکہ بڑی خوبصورتی سے ہماری ہی روزمرّہ کی زندگی کے مناظر میں ہم کو گم کر دیتے ہیں۔ ان آئینوں میں ہم کو خود اپنی حماقتوں کے عکس دکھائی دیتے ہیں لیکن لطف یہ ہے کہ ہم انھیں دوسروں سے اور دوسرے ہم سے منسوب کرکے ہنستے اور قہقہے لگاتے ہیں۔

ان کی حقیقت نگاری اپنے وقت کی رومانویت کے خلاف ایک شدید ردِّ عمل اور بغاوت تھی۔ انھوں نے بجائے مرصع کاری کے واقعیت اور حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے فنکاری پر زور دیا اور زندگی کو ہم سے اور بھی قریب کر دیا۔

وہ اپنے زمانے کے ہنگامی اور معاشرتی مسائل، قدیم و جدید مشرق و مغرب میں نہیں الجھے بلکہ عمومی اور آفاقی مسائل کو روزمرہ کی زندگی سے انتخاب کرکے ان کے مختلف گوشوں کو ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ موضوعات کی تازگی کی وجہ سے ان کی تحریریں ہر دور میں اور ہر شخص کے لیے واردانِ تازہ کی حیثیت رکھیں گی۔ دیکھئے ابھی مضامین شروع نہیں ہوتے کہ وہ ہمیں کوئے ظرافت میں کھینچ لے جاتے ہیں۔

"اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے۔ اگر آپ نے کسی سے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔ اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں۔"

مشاعرے اور ہنگامے آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ شہروں کا انتظام میونسپلٹیاں جس سلیقے سے کرتی ہیں اس سے کون واقف نہیں۔ ریل پر کس نے سفر نہیں کیا ہے؟ لیکن "کتے" ان کو زندہ رکھنے کے لیے کافی تھا مگر جس طرح غزل کا ایک اچھے شعر کے کہنے کے لیے پوری غزل کہنا پڑتی ہے۔ اسی طرح انھوں نے اس مضمون کی رعایت سے پورا مجموعہ ترتیب دے دیا۔ غزل ایسی مرصع نکلی کہ اس کا ہر شعر حاصل غزل ٹھہرا۔

"مرحوم کی یاد میں" نہ صرف اُن کے بلکہ اُردو ظرافت کے شاہکار مضامین میں ہمیشہ ممتاز رہے گا۔ تصویرکشی کا کمال اس میں اپنے پورے عروج پر ہے لکھتے ہیں۔

"دس قدم بھی نہ چلنے پایا تھا کہ اب کی بار ہینڈل یک لخت نیچا ہو گیا۔ اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھر اونچی تھی۔ میرا تمام جسم آگے جھکا ہوا تھا۔ تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا جو ہینڈل پر رکھے تھے اور برابر جھٹکے کھا رہے تھے۔ آپ میری حالت تصور میں لائیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ میں دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو۔"

"مرید پور کا پیر" مزاحیہ پیرایہ میں نفسیاتی تجزیہ کی بہترین مثال ہے۔ لکھتے ہیں۔

"ہال میں سناٹا چھا گیا، سب لوگ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور سہارے کے لئے میز کو پکڑ لیا۔ میرا دوسرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ وہ بھی میں نے میز پر رکھ دیا۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میز بھاگنے کو ہے اور میں اسے روکے کھڑا ہوں۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور مسکرانے کی کوشش کی، گلا خشک تھا۔"

"اردو کی آخری کتاب" میں مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی ریڈروں کا جتنا بہترین خاکہ اڑایا ہے اس کی ہمارے ادب میں مثال مشکل سے ہی ملے گی۔ لکھتے ہیں۔

"ماں لیٹی ہے۔ باپ بیٹھا پنکھا جھل رہا ہے۔ بیٹا انگوٹھا چوس رہا ہے۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔ برتن لاکر سامنے رکھ دیتی ہے پیچھے کبھی نہیں رکھتی۔ ابھی شوہر کھانا کھا ے گا تو بیوی برتن اٹھائے گی۔ یوں اگر روزانہ برتن نہ اٹھائے تو شوہر کے سامنے ہزاروں رکابیوں کا ڈھیر لگ جائے۔"

غرض پوری کتاب میں ہنسانے کی کوشش نہ ملنے کے باوجود آپ ہنستے رہیں گے۔ یہ ان کے مضامین کا عام مزاج ہے۔ ان مضامین میں آپ کو وہ تمام جوہر مل جائیں گے جو ظرافت کے سرمایہ کی جان و ایمان ہوتے ہیں۔

پطرس کی تحریریں، تقریریں اور تراجم، ان کی دلکش و دل آویز شخصیت کے ایسے نقش ہیں جو عرصے تک ہمارے لئے نشانِ راہ بنے رہیں گے۔

کرشن چندر کی ظرافت

کرشن چندر کی ادبی زندگی کا آغاز مزاح نگاری سے ہوا، جب یہ دسویں درجے کے طالب علم تھے۔ اس وقت انھوں نے اپنا پہلا مضمون لکھا جو مزاحیہ تھا اور جس میں اپنے فارسی کے مولوی ماسٹر بلاقی کا خاکہ اڑایا تھا اس کا عنوان "پروفیسر بلیکی تھی"۔

جدید اردو ظرافت کے علمبرداروں میں کرشن چندر کی حثیت ایک روشن مینارہ کی ہے۔ عظیم بیگ چغتائی، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس، شوکت تھانوی کنھیا لال کپور، شفیق الرحمن اور ان کے دوسرے تمام ممتاز معاصرین میں یہ اس لئے محترم اور منفرد ہیں کہ طنز، مزاح، تحریف، انشار، زبان و بیان، فن، اسلوب اور لہجہ ٹکنیک، شعور، نظریے، آدرش، مشاقی، مغز، مواد، معیار اور مقدار کے اعتبار سے یہ لاثانی اور لافانی ہیں۔

کرشن چندر کے مضامین اور افسانوں میں ظریفانہ کیفیت بہت عام ہے اس کی پھلجھڑیاں آپ کو اُن کے سنجیدہ سے سنجیدہ مضامین اور افسانوں میں بھی چھوٹتی نظر آئیں گی۔ خواہ یہ چٹکیاں لے لیکر ہنسائیں، یا گدگدا کر، یا بڑی معصومیت سے اپنے ناظر کو تصویر کا دوسرا رخ دکھا کر اس کے پیٹ میں ہنسی کے بل ڈال دیں یا اس کے منہ سے ہنسی کے فوارے جاری کر دیں۔ بہت ممکن ہے کہ زندگی کی اس ناہمواری پر یہ خود بھی اُس کے قہقہوں میں شامل ہو جائیں یا اپنی ہنسی میں اس کو بھی شریک کر کے فضا زعفران زار کر دیں۔

کرشن چندر کی اس ہنسی میں، اُن کے شوخ لہجہ، مخصوص اندازِ بیان، سبک

اور شیریں زبان کے ساتھ ان کے نظریہ کی کھنک اور عقیدے کی گونج، ان کی ظرافت میں نہ صرف تہہ داری پیدا کرتی ہے بلکہ بامقصد ہونے کی وجہ سے اس میں صالح توازن اور گہری ادبیت بھی برقرار رکھتی ہے۔

کرشن چندر کی ظرافت میں شوخ و شنگ طنز کی نشتریت، اُن کے مضامین اور افسانوں کو دو آتشہ بنا دیتی ہے دو دھاری تلوار کا استعمال ان سے بہتر شاید ہی کوئی جانتا ہو۔ یہ شمشیر زنی کی کے فن میں طاق ہیں۔ ان کی تیغ آبدار کاٹتی بھی ہے اور چرکے بھی لگاتی ہے۔ مگر اس کا وار کبھی خالی نہیں جاتا، یہ زخمی کر دیتے ہیں، مگر خود گھائل نہیں ہوتے۔

طنز کے حربے ہیں یہ چٹکی اور گدگدی سے گردن زنی، گولہ باری اور بمباری تک کرتے ہیں۔ اس کارروائی میں میگزین اور توپ خانے سے یہ ایک تجربہ کار کمانڈر کی طرح کام لیتے ہیں اور زندگی کی ناہمواریوں کو نشانہ بنانے کے لئے یہ تیر سے راکٹ تک استعمال کرتے ہیں۔

ادب زندگی اور سماج کے مقامی ماحول سے عالمگیر پس منظر تک یہ حیات وکائنات کی ناہمواریوں کی نشانہ بناتے چلے جاتے ہیں۔ ماحول کا گہرا مشاہدہ احساس کی خداداد دولت، شعور کی بے پایاں بلندی، شاہدِ معنی کی دوربینی اور مطالعہ کی وسعت اِن کے طنز کو ایسی ندرت اور انفرادیت بخشتی ہے جس کے یہ موجد اور خاتم ہیں۔

کرشن چندر کی ظرافت اِن کے مضامین، افسانوں، ناولوں، ڈراموں اور رپورتاژوں وغیرہ میں بکھری ہوتی ہے۔ یہ ظرافت اُردو طنز ومزاح کے سرمائے کا قیمتی حصّہ اور ہمارے مزاحیہ ادب کی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے۔ اس کی بھی مثال "گھونگٹ میں گوری جلے ہے"

... "عدم تشدد کے فلسفے : بو ٹرنگ کی روٹیوں اور غلط املا سے بھری ہوئی کاپیوں نے مجھے بے حد بزدل بنا دیا ہے ۔"

"جان پہچان" ۔ اجنبیوں اور دشمنوں کے بعد ہمارا پالا دوستوں سے پڑتا ہے جن کو ہم زندگی بھر برتتے اور بھگتتے ہیں۔ لیکن ان کے درمیان بھی ایک مخلوق ہے، جس کو ہم "جان پہچان" والوں کے نام سے یاد کرتے ہیں، جو آپ سے صرف ملنے کے لئے ملتے ہیں۔ ان کے پاس تعلقات اور دوستی کی نہ کوئی پالیسی ہوتی ہے اور نہ پروگرام۔ ان سے کترانے اور رخصت ہونے کے لئے ہم بے قرار رہتے ہیں، موقع ، مزاج ، مذاق کسی پہلو سے بھی یہ ہمارے نہ ہوتے ہوئے بھی یہ ہم سے زندگی کے ہر موڑ پر ٹکراتے رہتے ہیں ، ایسے کسی بور سے اگر کوئی غلطی سے بھی متعارف کرا دے تو کبھی اس کی غلطی معاف نہیں کی جا سکتی ۔ اس کی جھلکیاں بھی دیکھئے ۔

> "جان پہچان کے لوگوں سے خوش کلامی سے پیش آنا میرے لئے ایک نہایت دشوار امر ہو گیا ہے ۔ گو یہ لوگ آپ کو کبھی کبھار ملتے ہیں مگر جب ملتے ہیں تو اتنا زچ کرتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ ان کے منہ پر زور سے ایک چانٹا رسید کر کے کہا جائے ، آداب عرض ، بندہ اب چلتا ہے ۔ امید ہے پھر کبھی ملاقات ہوگی ، کچھ تھوڑی سی بدتہذیبی تو ہے مگر میں سوچتا ہوں کہ اگر یہ بدتہذیبی دوستوں میں جائز ہے تو جان پہچان کے لوگوں میں کیوں نہ روا رکھی جائے ..... میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ آدمی کسی سے 'جان پہچان' نہ رکھے چند دوست بنائے اور بہت سے دشمن ترقی کرنے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی حربہ نہیں ۔"

"غسلیات" ۔ ان کا بہت پُر لطف مزاحیہ ہے جو غالباً جاڑوں میں لکھا گیا

ہے۔ پورا مضمون نہ نہانے کے دفع میں ہے مگر آخر میں مصنف پانی ٹھنڈا ہو جانے کے خوف سے قلم رکھ کر تولیہ اٹھا کر نہانے کے لیے غسل خانے میں اپنے آپ کو بند کر لیتا ہے۔

"رونا" ان کا دلچسپ انشائیہ ہے۔ اس میں ان کی خیال آرائی کی داد دیجیے:

"رونا صحت کے لیے مفید اور روح کی غذا ہے۔ اس لیے اس کی عادت ڈالنے کے لیے، ادبی مجلسوں کی طرح رونے کی مجلسیں قائم کی جائیں، اسکولوں اور کالجوں میں رونا لازمی مضمون قرار دیا جائے۔ ایسی فلمیں دکھائی جائیں جہاں بڑے بڑے آدمی رو رہے ہوں۔ بڑے آدمیوں کو روتا دیکھ کر عوام بھی بے اختیار رونے لگیں گے۔ ورزش کیلئے بھی یہ طریقہ مفید رہے گا اور موسیقی میں بھی صحت کو بہتر بنانے کے لئے اچھے اچھے رونے والوں کے ریکارڈ بھرے جائیں، ملکۂ موسیقی کی طرح ملکۂ گریہ وغیرہ کو سنا جائے۔

لڑکپن کا رونا ایسا ہے جیسے برسات کی بارش۔ ذرا استاد نے دو چار بید لگا دیے تو رو رو کر جھڑی لگا دی۔ ادھر ماسٹر نے پچکارا، ادھر تبسم نما آفتاب نکل آیا.......

بڑھاپے میں بھی لوگ روتے ہیں، مگر اس طرح روتے ہیں کہ خواہ مخواہ ہنسی آتی ہے...

......رونے کے آرٹ کو اگر دنیا میں کسی نے بہترین صورت میں پیش کیا ہے تو وہ عورت ہے۔ اگر عورت کے چند آنسو دنیا میں انقلاب بپا کر سکتے ہیں تو مرد کے آنسو کیا نہ کر سکیں گے۔"

"بیچلر آف آرٹس" ایک غریب اور یتیم ڈگری کا انگریزی نام ہے جسے آپ اعزازیا انگریزی مٹھائی سمجھتے ہوں تو غلطی پر ہیں۔ یہ تو بے چارے بی اے، کو کہتے ہیں۔

چند دنوں تک ہم نے بھی یہی سمجھا کہ اب ڈپٹی کمشنر صاحب کا حکم آیا کہ اب آیا سرکار، تمھارے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر لینے پر بہت خوش ہے اور عالی ہمتی کے صلے میں وہ تمہیں تحصیل دار یا ڈپٹی یا کپتان پولس کا عہدہ سونپتی ہے۔ لیکن دن کیا مہینے گزر گئے اور سوائے ایک سائیکل کے

چالان کے اور کوئی سرکاری پروانہ نہ آیا۔"

"بیچلر آف آرٹس" ناقص تعلیمی نظام اور بے روزگاری پر شدید طنز ہے۔

"باون ہاتھی" صدر کانگرس کا باون ہاتھی اور بارہ بیلوں کی گاڑی پر جلوس نکالنے پر مصنف نے ملک کے سامنے یہ دلچسپ تجویز رکھی۔

....." امسال صدر کے جلوس میں ایک بچہ گاڑی اور چند بکریاں بھی شامل کی جائیں تاکہ اُس قرونِ وسطےٰ کی تہذیب جس کا احیا ہمارے رہنما چاہتے ہیں دوبارہ زندہ ہو سکے۔"

حقیقت یہی ہے کہ جب تک ہندوستان میں گڑ، چرخہ اور ہاتھی برسرِ اقتدار رہے گا، یہ بدنصیب ملک کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔"

قطع نظر طنز کی نشتریت، ان کے گہرے سیاسی اور سماجی شعور اور روشن خیالی کی بھی ہمیں داد دینی ہوگی۔ "باون ہاتھی" صالح ترقی پسندی کا اچھا نمونہ ہے

"سوراج کے پچاس سال بعد" کرشن چندر کا ایسا طنز یہ ہے جس میں آنے والے زمانے کے بارے میں ان کی پیشین گوئی، تجزیہ اور ادراک حیرت انگیز ہے۔

جگہوں کے نام بدلنے، قومی وقار کو متنازعہ بنانے، لسانی جھگڑوں، تشدد، فرقہ واریت ذہنی، ثقافتی اور سیاسی تنگ نظری، بے روزگاری، مہنگائی، چوربازاری سبھی انھوں نے بہت سخت حملے کئے ہیں۔

"مانگے کی کتابیں" اگر آپ کو کتابیں خریدنے اور رکھنے کا شوق ہے تو لوگ آپ سے بھی کتابیں مانگ کر ضائع کرنے، کھونے یا نہ واپس کرنے کے لیے لے جاتے ہوں گے۔ مصنف نے اس مسئلہ پر دلچسپ خیال آرائی کی ہے۔

"ہوائی قلعے" کون نہیں بناتا۔ ہماری ساری زندگی ایک ہوائی قلعہ ہے جس میں بیٹھ کر ہم خیالی پلاؤ پکاتے ہیں اور اسی میں ہماری ساری زندگی گزر جاتی ہے۔ "ہوائی قلعے"

ان کا بہت ہی مکمل انشائیہ ہے۔

"نقد ونظر" اور "پانی کا گلاس" ان کی پیروڈیاں ہیں جن میں بے ہنگم ادب اور فلموں کی تحریف لکھی ہے۔

کرشن چندر کے مزاحیہ افسانوں کے مجموعے "مزاحیہ افسانے" میں "صحت خراب ہے" "چلتا پرزہ" "قحط اگاؤ" "ماہر نفسیات" "جھاڑو" "مینڈک کی گرفتاری" "میرا من پسند صفحہ" "مونگ کی دال" "اخباری جوتشی" "فلمی قاعدہ" "سیٹھ جی" اور "صاحب" شامل ہیں۔

"مزاحیہ افسانے" کرشن چندر کے سیاسی اور سماجی شعور، ترقی پسندی، روشن خیالی، اور درد مندی کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے افسانوں میں جو طنزیہ لہر ملتی ہے، اس کی ارد پیاس بہت تیز ہے۔ ان کے ستھرے، بامقصد اور مہذب مزاح کی گل کاریوں نے اس طنز میں ایک شان پیدا کردی ہے۔

"صحت خراب ہے" میں ان لوگوں کا مذاق اڑایا گیا ہے، جنھیں یہ مالیخولیا رہتا ہے کہ وہ بیمار ہیں۔ اُن کا یہ وہم ان سے جو مضحکہ خیز حرکتیں کراتا ہے ان کو انھوں نے اپنے طنز و تمسخر کا نشانہ بنایا گیا ہے کبھی کبھی نہ کوئی درد ہوتا ہے، نہ دوا ہوتی ہے، محض ایک خیال خام ہوتا ہے جو بڑھتے بڑھتے درد کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس حد تک کہ اچھے بھلے آدمی اپنے تئیں کہنے لگتے ہیں۔ "یار میری طبیعت خراب ہے۔" اس خرابیٔ صحت کا نقشہ بھی دیکھئے:-

"ایک صاحب ہیں جن کی ٹانگیں ہمیشہ درد کرتی رہتی ہیں۔ لیکن آپ انھیں چلایئے تو دس میل تک چلے جائیں گے اور کبھی رکنے کا نام نہ لیں گے۔ ایک صاحب کے دانتوں میں ہمیشہ درد رہتا ہے۔ لیکن موقع پڑنے پر بادام سے لے کر لوہے کی کیل تک چبا لیتے ہیں۔ ایک صاحب جن کی آنکھیں ہمیشہ دکھتی ہیں لیکن وہ دن میں تین بار سنیما دیکھتے ہیں۔"

صحت کے سلسلے میں یہ بھی یاد رکھیے کہ "صحت صرف افراد کی خراب نہیں ہوتی بلکہ سماج کی صحت بھی خراب ہوتی ہے" جس کی وجہ صحت سے زیادہ نیت کی خرابی ہے۔

"چلتا پرزہ" کو اصفت اور طوطا چشم قسم کے انسانوں پر طنز ہے۔

"قحط اگاؤ"، میں مزاح کے ساتھ ساتھ انتہائی شدید طنز بھی نوکر شاہی اور تاناشاہی پر ہے۔ ترقی پسند ظرافت میں اس افسانے کی ہمیشہ ایک اہمیت رہے گی۔

ہندوستان کے خوراک کے مسئلے کو سلجھانے کے بارے میں شکوہ کرتے ہیں:۔

"سب سے پہلے تو ہم نے "ٹائمز آف انڈیا" اور "ہندوستانی ٹائمز" کے کالموں میں "اناج اگاؤ" مہم شروع کی۔ یہ اسکیم ناکامیاب ہوئی۔ کیوں کہ کسان "ٹائمز" نہیں پڑھ سکتے اور اگر وہ پڑھ سکتے تو بھی وہ اُن پر عمل نہیں چلا سکتے تھے۔

اس میں ضرورت تو تھی صرف ٹریکٹر اور زمین کے خطوں کی، مگر اس کے بجائے ہم نے ردّی پریس استعمال کیا ...... یہ لفظوں کے انبار تو پیدا کر سکتی ہے، اناج کا ایک دانہ تک پیدا نہیں کر سکتی ہم نے وزیروں کی تقریریں پیدا کیں، اشتہارات پیدا کیے اور افسروں کی ایک فوج پیدا کی، جنھوں نے قلم اور کاغذ کی مدد سے اپنی ڈسکوں پر اناج اگانے کی کوشش کی...... اناج اگانے کے لیے ہمیں زمین کی ضرورت ہے اور زمین گاؤں میں ہوتی ہے، سول سکریٹریوں کی چھتوں پر نہیں۔ اسلیے یہ اقدامات بھی ناکام ہوئے۔"

ایک وقت بھوکے رہو، "درخت اگاؤ"، اور اناج اگاؤ ہیں بھی اسلیے ناکامی ہوئی کہ مارکسی طریقۂ کار پر عمل درآمد نہیں کیا گیا۔ اس مسئلے کو مالتھیس یا گاندھی نہیں بلکہ مارکس حل کر سکتا ہے۔ مارکس نے کہا

تھاکہ زمین کسان کو دو۔ کام کرو۔ پیدا کرو۔۔۔۔ اور حاصل کرو۔

عوامی حکومت کے غیر عوامی رویے پر طنز کرتے ہیں۔

"اگر قحط سے بھی مسئلہ حل نہ ہو تو امداری طریقہ استعمال کیا جائے کسان تحریکوں کو تہہ تیغ کرو۔ طلبا کی تحریکوں کو تہہ تیغ کرو۔ سب مخالف تحریکوں کو تہہ تیغ کرو۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھو کہ عوام ہندوستان میں بھی نا قت پکڑیں گے۔ عوام غیر فانی ہیں۔"

"ماہر نفسیات" میں امریکہ کی بورژوا ذہنیت کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ ان ماہر نفسیات کا مذاق اڑایا ہے جو مرض کو مرض اور انسانی تکلیف کو تکلیف نہیں مانتے۔ جو چاہیں تو آپ آنکھوں سے سُن سکیں، کانوں سے دیکھ سکیں، ناک سے چھو سکیں، اور زبان سے سونگھ سکیں، انھیں ڈاکٹروں نے ایک حبشی کو گورا ضرور کر دیا، مگر

"اس کی پتلون پھٹی ہوئی ہے۔ اس کی ناک پہلے سے کہیں خوبصورت ہوگئی لیکن اس کے پاؤں میں جوتا نہیں ہے۔ اس کا جبڑا گھوم کر ٹھیک بیٹھ گیا ہے۔ لیکن اس جبڑے کے اندر گندم کا ایک دانہ نہیں گیا ہے۔ انھوں نے لوہے کا پھیپھڑا تو ایجاد کر لیا، لیکن سماج کے نفس کو ٹھیک نہیں کر سکے۔"

"جھاڑو بنانے مس بیلا باٹلی والا" بورژوا طبقے کی نمائندہ ہے۔ اس کے پردے میں کرشن چندر نے بڑی کامیابی کے ساتھ برتر طبقے کی اس مخصوص ذہنیت کو بے نقاب کیا ہے جو اندر سے بہت گھناؤنی اور مکروہ شکل رکھنے کے باوجود ظاہری چمک دمک سے عوام کو جہاں ایک طرف متوجہ کرنے کے لئے محلوں میں رہتے ہوئے بھی جھونپڑیوں کے خواب دیکھتا ہے وہاں ان کا خون چوستا ہے اور عوامی تحریکات کو کچلنے کے درپے رہتا ہے۔ ادب اور زندگی میں اس قسم کے سرمایہ دار اور بورژوا کردار بہت عام ہیں۔

جب اخباری رپورٹر مس بیلا سے پوچھتا ہے "آپ نے کارل مارکس کی کتابیں

پڑھی ہیں؟ تو وہ جواب دیتی ہے۔ "پڑھا تو نہیں ان کی فلم دیکھی تھی۔ "مارکس برادرز" جس میں مارکس اور اس کا بھائی کادل کام کرتا ہے اور دو بھائی اور تھے۔ بڑے اچھے مسخرے ہیں۔"

انٹرویو دینے والا۔ "میں مسخروں کی بات نہیں کرتا، میں اس موجودہ دنیا کے عظیم ترین فلسفی کی بات کر رہا ہوں۔"

بیلا۔ "اوہ! فلسفی ...... فلسفہ ...... معاف کرنا مجھے فلسفے سے زیادہ کشیدہ کاری پسند ہے۔"

رپورٹر۔ "اچھا تو آپ کو کشیدہ کاری پسند ہے" "مجھے تو بڑے ایڈیٹر نے بتایا تھا کہ آپ کو سوشلزم سے بڑی دلچسپی ہے۔"

بیلا۔ "مجھے سوشلزم بہت پسند ہے، میرا ایک چاہنے والا ...... میرا ایک دوست ہے سودیش کمار وہ مجھے سوشلزم سمجھاتا رہتا ہے۔ بڑا اچھا لڑکا ہے اس کے باپ کی چھ ملیں ہیں۔"

رپورٹر۔ "تو آپ سوشلسٹ ہیں؟"

رپورٹر۔ "آپ کیا کام کرتی ہیں؟" ......

مس بیلا۔ "کچھ نہیں"

"مس آپ کے باپ کیا کام کرتے تھے؟"

"بیلا۔ "کچھ نہیں۔"

"آپ کے باپ کے باپ؟"

بیلا۔ "کچھ نہیں"

رپورٹر۔ "آپ کس سے شادی کریں گی؟" "میری شادی تو ایک بلیک مارکیٹر سے کریں گی۔ لیکن محبت ایک سوشلسٹ سے۔!" "بھنگیوں کا ہڑتال توڑنے کے لیے۔"

رپورٹر۔ "ایڈیٹر صاحب نے کہا تھا، اگر آپ راضی ہوں تو وہ خود کانگرس سے

کہہ کے ایک جلوس کوٹھی کے باہر بھیج دیں گے اور اسکول کے لڑکے لڑکیاں بھی آجائیں گی ترنگا لے کر۔"

رپورٹر "..... آپ جھاڑو پھیریں گی' وہ (گورنر) اس رسم کا افتتاح کرفرمائیں گے"

جب بھنگن، مس بیلا سے جھاڑو چھین کر سب کی ٹھکائی کرتی ہے تو مجمع 'بھنگن زندہ باد' کے نعرے لگاتا ہے۔

ایک کھدر کی ٹوپی والا ۔۔۔ "ارے جندہ باد نہیں' مردہ باد کہو' نہیں تو ہیں پیسے نہیں دوں گا۔"

مجمع سے آوازیں ۔۔۔ "ارے کون تیرے پیسے لیتا ہے، گھر رکھ اپنے پیسے، سالا ہڑتال توڑ، کالا چور!"

مس بیلا باٹلی والا یہاں کی گرم آب و ہوا کی تاب نہ لاکر سوئٹزرلینڈ روانہ ہو جاتی ہیں اور افراتفری پر یہ دلچسپ ڈرامہ ختم ہو جاتا ہے۔

"مینڈک کی گرفتاری" ۔۔۔ میں گرشن چندر نے مینڈکوں کی زبان سے انسانی خامیوں کا مذاق اڑایا ہے۔ ۔۔۔ ایک انسانی دوسرے انسان کو کھا جاتا ہے۔ اس کا لہو پیتا ہے۔ اسے غلام بنا کے رکھتا ہے۔ اس کی بیوی بچوں کو اپنی املاک سمجھتا ہے اور اسے وہ اپنی تہذیب اور شرافت میں شمار کرتا ہے۔ اور جو اپنی ایسی بدی جتنی زیادہ کرتا ہے اتنا ہی بڑا سمجھا جاتا ہے۔ ...... انسانوں کی دو زبانیں ہوتی ہیں ایک تو وہ جو بولتے ہیں ۔۔۔ دوسری وہ جسے وہ دل میں رکھتے ہیں۔ اور اکثر وہ لفظ جو دل میں ہوتا ہے کبھی زبان پر نہیں آتا، اکثر جو منہ کی زبان ہوتی ہے' وہ دل کی زبان کے خلاف ہوتی ہے۔"

"میرا من پسند صفحہ" ۔۔۔ اخبار پڑھنے والوں اور اخبار میں چھپنے والی خبروں اور اشتہارات پر ایک دلچسپ مزاحیہ ہے۔

"مونگ کی دال" — کرشن چندر کی سیاسی ظرافت کا لاجواب شاہکار ہے
یہ ان کا محبوب موضوع ہے۔ اس میں نے کانگرسی حکومت کی خامیوں اور ناہمواریوں
پر شدید طنز کئے ہیں اور بے پناہ مذاق اُڑایا ہے۔ عام سر ذہنیت کا اندازہ کیجئے
ایک حزب مخالف ممبر کے رشوت قبول کرنے پر "مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پرمٹ
میں کتنی طاقت ہے۔ قوت سے اپنی بات منوانے کی۔ اس دن سے میں اپنی دائیں جیب میں
پرمٹ اور بائیں جیب میں باقی سب ممبروں کو رکھتا ہوں۔"

"اخباری جوتشی" — میں اُن توہم پرست انسانوں کا مذاق اڑایا گیا ہے جو قوتِ بازو
سے زیادہ تقدیر اور تقدیر سے زیادہ ٹھگ وِدّیا پر ایمان رکھتے ہیں اور کوئی کام کرنے
سے پہلے اُس کا شگون لینا ضروری سمجھتے ہیں۔

"سیٹھ جی" — میں فلمی اجارہ دار سیٹھوں کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ ان کی سرمایہ
دارانہ ذہنیت کی دھجیاں اڑاتی ہیں۔

"فلمی قاعدہ" دراصل فلمی دنیا کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ بمبئی، فلم ایکٹر، فلم ایکٹریس،
ان کے رکھوالے، شاعر، مسکہ پالشی، لال پری اور انگوٹھا چومنے اور انگوٹھی اتارنے
والے سب کے بارے میں آپ بہت کچھ جان جائیں گے۔ لڑکی لڑکے اگر ہیروئن، ہیرو بننے
کے لئے بمبئی بھاگنے سے پہلے اسے ایک بار پڑھ لیں تو بقیہ زندگی سنور جائے۔

"صاحب" میں غذائی مسئلے سے لاپرواہی، مارشل پلان اور مسائل سے گریز پر
پر طنز کیا گیا ہے۔

کرشن چندر کی ظرافت کی چاشنی ان کے سنجیدہ افسانوں میں بھی ملتی ہے۔ طنز کی
نشتریت اور مزاح کے چھینٹے ان کی ان تحریروں کو باغ و بہار بنا دیتے ہیں۔ "پرانے خدا"
"تین غنڈے"، "ان داتا"، "ہم وحشی ہیں"، "مہالکشمی کا پل"، "ایک گرجا ایک خندق"، "بادشاہ"، "نئے
غلام"، "ہائیڈروجن بم کے بعد"، "کتاب کا کفن"، "اردو قاعدہ"، "زندگی کے موڑ پر"، "بڑے آدمی"

"ہوائی قلعے" کرشن چندر کی باقاعدہ مزاح نگاری کی پہلی دستاویز اور ان کے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ غلط فہمی "گانا" جان پہچان" علمیات" بدصورتی۔ رونا بچلر آف آرٹس" ٹوپ والا" شادی" عشق اور ایک کار" تیسری سلور جبلی" الف لیلیٰ کی گیارھویں رات" پہلیں" نقد و نظر" میں نے جاپان میں کیا دیکھا" بادن ہاتھی" سورج کے پچاس سال بعد" مانگے کی کتابیں" پانی کا گلاس اور ہوائی قلعے" کرشن چندر کے وہ یادگارِ زمانہ مضامین ہیں، جو" ہوائی قلعے" کی زیب و زینت ہیں" ان میں غلط فہمی جان پہچان" علمیات" رونا" بچلر آف آرٹس" بادن ہاتھی" سورج کے پچاس سال بعد مانگے کی کتابیں" اور ہوائی قلعے" ان کے نمائندہ شاہکار ہیں۔

"ہوائی قلعے" کے مضامین میں کرشن چندر نے سچ کو جھوٹ ماننے والوں متوسط طبقے پر فلم کے مضر اثرات، اپنوں کو بھگتنے اور دوسروں کو بنی بگاڑنے والوں ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھنے والوں، ناقص تعلیمی نظام، کالے صاحبوں، عشق کے مادی پہلو، خیالی دنیا میں بے عمل زندگی گزارنے والوں، راتوں کو گھر سے غائب رہنے والوں سستے ادب، بور کرنے والوں، کانگریس، آزادی کی بربادی، کتابیں مانگنے والوں گھسے پٹے فلموں اور خیالی پلاؤ پکانے والوں کا مذاق اڑایا ہے اور ان پر طنز کیا ہے۔

" غلط فہمی میں ان لوگوں کا مذاق اڑایا ہے جو اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لیے ایک بامروّت شخص کو گھیرتے وقت اس کی مجبوری کو نظر انداز کر جاتے ہیں، چار و ناچار یہ بھی مرنجان مرنج طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اس بارے میں ان کا یہ جملہ قابلِ غور ہے۔

ہمدردی" اور "اجنتا کے آگے" وغیرہ میں آپ کو اُن کے اُن مخصوص طنز کی لہر محسوس ہو گی۔ اسی طنز کی کار فرمائی "سمندر دور ہے" "کوپن" "لال گھسیٹا رام" "گویاں کرشن کو کھلے" "باتیں" بہار کے بعد میں ملے گی۔ "سمندر دور ہے" کے طنزیہ افسانوں کے علاوہ "فلمی قاعدہ" کے افسانوں اور مضامین میں "فلمی قاعدہ" "گیدڑ کی ضرورت ہے" "جانی واکر اور شیر" — "ناگ منی" "فلمی قاعدے" میں بہت دلچسپ افسانے ہیں۔

"سرائے کے باہر" — "قاہرہ کی ایک شام" — "حجامت" — "یہاں سب خلیط ہیں۔ شکست کے بعد" — اور "دروازہ" وغیرہ کرشن چندر کے طنزیہ مزاحیہ ڈرامے ہیں۔ "سرائے کے باہر" اور "میں بیلا باٹلی والا" اردو کے مزاحیہ ڈرامے کی [illegible] میں ایک اہم اضافہ ہیں۔

مضامین اور افسانوں کی طرح کرشن چندر کی مزاحیہ ڈرامہ نگاری پر بھی پوری قدرت ہے۔ اسٹیج، اسکرین اور اسٹوڈیو کی فنی نزاکتوں پر عبور ہونے کی وجہ سے کرشن چندر اس میدان میں بھی ہمیں سب سے آگے نظر آتے ہیں۔

کرشن چندر کے ناولوں میں بھی یہی اصلاحی ظرافت ملتی ہے۔ "شکست" "باون پتے" "ایک گدھے کی سرگذشت" "گدھے کی واپسی" "ایک گدھا [illegible] میں" "غدار" "دادر پل کے بچے" "بورین کلب اور چاندی کے گھاؤ" اُن کے نمائندہ طنزیہ ناول ہیں۔ "ایک گدھے کی سرگذشت" "گدھے کی واپسی" "ایک گدھا نیفا میں" اور "دادر پل کے بچے" اردو کے مزاحیہ ناولوں میں مستقل اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان ناولوں میں دلنشینی، جاذبیت، دفتری نظام کا مذاق، بچوں کے مسائل پر تفکر، تعصب، جہالت اور رجعت کے اندھیروں پر طنز ملتا ہے۔ اپنے مترنم انداز بیان، لطیف اور شائستہ فکر میں زندگی کے کھوکھلے پن کو انھوں نے جس طرح ہنس ہنس کر نمایاں کیا ہے۔ اس کی ہمیشہ ایک اہمیت رہے گی۔ "دادر پل کے بچے" میں دکھایا گیا ہے کہ بھگوان بھی جب دنیا میں آئے اور اپنے بچوں سے ملے تو وہ بھی ان کو اس حال میں دیکھ کر شرما گئے۔ بچوں کے مسائل پر ان کے لئے طنزیہ ناول ایک تلخ

حقیقت ہے ایسی حقیقت جس میں افسانہ کم اور اصلیت زیادہ ہے۔

"ایک گدھے کی سرگذشت" اور "گدھے کی واپسی" میں ہمارے دفتری نظام فیتہ شاہی، نوکر شاہی اور افسر شاہی کی کرشن چندر نے دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ "گدھا" اُس عام اور ضرورت مند اعمال کی علامت ہے جو دفتروں میں دھکّے کھاتا ہے۔ فائل کے ساتھ ساتھ وہ بھی چلتا رہتا ہے۔ مگر اس کا کام نہیں چلتا۔ کرشن چندر کا گدھا اُن گدھوں کی بھی علامت ہے جو گدھے ہونے کے باوجود اچھے خاصے انسانوں کو گدھا بنائے ہوئے ہیں۔

ہمارے جدید طنزیہ ناول اور مزاحیہ ادب میں اس بات کا دوسرا ناول نظر نہیں آتا "چڑیوں کی الف لیلیٰ" اور "الٹا درخت" ان کے بچوں کے لیے لکھے گئے ناول ہیں۔ مگر "گدھے کی سرگذشت" یا "الٹا درخت" اور چڑیوں کی الف لیلیٰ ان کی اردو کے مزاحیہ ادب میں وہی حیثیت ہے جو انگریزی ادب میں سوئفٹ کے سفرناموں کی۔

ان ناولوں میں جو فضا ماحول اور کردار ہیں وہ ہمیں نئی دنیا میں اپنی دنیا کی یا اپنی دنیا میں ایک بالکل ہی دوسرے عالم میں پہنچا دیتے ہیں۔

"کرشن چندر" ایک گدھے کی سرگذشت، کے بعد ایک لفظ بھی نہ لکھتے تب بھی اردو کے مزاحیہ ناولوں میں ہمیشہ سب سے سرفہرست رہتے۔ لیکن انھوں نے دو اور لازوال تمثیلی ناول دے کر بچوں کے ادب کو مالا مال کر دیا ہے۔

"چڑیوں کی الف لیلیٰ" اور الٹا درخت" بڑے بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں۔ اتنے بڑے بچوں کے لیے جو "ایک گدھے کی سرگذشت" پڑھتے ہیں، جو "ہوائی قلعے" "کالو بھنگی" "مہالکشمی کا پل" "سرائے کے باہر" اور "فلمی قاعدہ" پڑھتے ہیں، جو سوئفٹ کے سفرنامے اور ٹامس مور کا یوٹوپیا، پڑھتے ہیں۔

ڈرامے میں لپٹا ہوا یہ غیر متوقع طنز، بڑھنے والوں کو ایک نئی دنیا میں بڑی معصومیت کے ساتھ اسی دنیا کی ناہمواری دکھا کر اس کے جذبات کو ہنسی میں بہائے جانے ایسی مکمل

تمثیل پیش کرتے کہ جس پر سچ مچ اصلیت کا گمان ہو پھر ان کے انداز بیان کی جاذبیت لطافت اور شگفتگی کی دوسری مثال ہمیں اردو کے جدید طنزیہ ناول میں کہیں اور نہیں ملتی۔

کرشن چندر نے مزاحیہ اور تمثیلی ناول کی روایت کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ بہت آگے بھی بڑھا دیا ہے۔ ناول اور تمثیل کے انداز اور اسلوب کے وہ موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔

ناول ہو یا ڈرامہ، افسانہ ہو یا مضمون، ہر صنفِ ادب میں کرشن چندر نے اردو کے مزاحیہ ادب کو بہت مالا مال کیا ہے۔

طنز، مزاح، رمز، تحریف، تمثیل ہر میدان میں ہمیں کرشن چندر بہت ممتاز اور نمایاں نظر آتے ہیں۔

کرشن چندر کا باغ و بہار اسلوب، رواں دواں اندازِ تحریر، انوکھا ذہن اور ظرافت کو اُن کی دین۔ اس مختصر مضمون یا کسی معمولی کتاب میں نہیں سما سکتی۔

اردو ظرافت کی تاریخ کے اس سنہری باب کی تکمیل کے لئے ان پر سنجیدگی سے تنقید و تحقیق کی ضرورت ہے۔ ذاتی خوشی و ناخوشی سے بلند ہو کر، فتنۂ معاصرت اور سینے کی آگ کو دبا کر ان کے مترجمین سے بھی زیادہ سنجیدگی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ نکتہ چینی بہت آسان ہے مگر علمی انداز سے تلاش و تحقیق اور فن کار کے رتبے کا صحیح طور پر تعین بہت مشکل کام ہے۔ اگر یہ مشکل کرشن چندر کی زندگی میں آسان ہو جائے تو ادب اور ادیب دونوں کے حق میں بہتر ہو گا۔

کرشن چندر اپنی نسل کے سب سے ممتاز اور منفرد مزاح نگار ہیں۔ افسانے کی طرح مزاح تاریخ میں بھی ان کی حیثیت ہمیشہ ایک روشن اور سنہرے باب کی ہے اور رہے۔

مشتاق احمد یوسفی کی مزاح نگاری

اردو ظرافت میں اعلیٰ مزاح اور لطیف تر طنز کا ارتقائی سلسلہ خطوط غالب سے شروع ہوتا ہے منشی سجاد حسین، ستم ظریف، نواب سید محمد آزاد، احمد علی شوق، مرزا فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی، پطرس شوکت تھانوی، رشید احمد صدیقی، کرشن چندر، کنہیا لال کپور، شفیق الرحمٰن ابن انشا، وغیرہ اس سلسلے کی دوسری اہم کڑیاں ہیں۔

مرزا غالب، پطرس، رشید احمد صدیقی، کنہیا لال کپور، شفیق الرحمٰن وغیرہ اردو ظرافت کے جس اسکول سے تعلق رکھتے ہیں اس دبستاں میں مشتاق احمد یوسفی فکر و فن، طنز و مزاح معیار و مذاق، اسلوب و انداز، تاثر و دلنشینی اور ذوق و ذہانت کے اعتبار سے بہت بلند اور ممتاز نظر آتے ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کی ظرافت لہجے، مغز، تہذیب اور شائستگی کے اعتبار سے مرزا غالب، پطرس، رشید احمد صدیقی اور شفیق الرحمٰن سے کہیں بلند و برتر۔ اعلیٰ طنز اور کلاسیکی رچاؤ میں فن و مواد کے اعتبار سے اگر ان کی منزل رشید احمد صدیقی سے بہت آگے ہے تو خالص مزاح میں ان کے یہاں شفیق الرحمٰن سے زیادہ رچاؤ اور ٹھہراؤ ہے۔ بلاشبہ اردو طنز و ظرافت کے رشید احمد صدیقی اور شفیق الرحمٰن دو اہم ترین نمائندے ہیں۔ ہم کسی بھی طنز نگار یا مزاح نگار کو انہی دو پیمانوں سے ناپتے ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ رشید احمد صدیقی کے یہاں لفظی تکرار اور الجھاؤ اور شفیق الرحمٰن کے یہاں لطیفوں سے بات میں بات پیدا کرنے کی جو عام روش ہے اور جو ان کی خوبی بھی ہے اور خامی بھی اس سے یوسفی کا دامن بھی پاک نہیں، مگر اس کے باوجود ان کی خوبیاں ان کی ان خامیوں پر پردہ ڈال دیتی ہیں

مشتاق احمد یوسفی کے طنزیہ مزاحیہ مضامین کے مجموعے "چراغ تلے" کی زینت اِن کے ۱۲ باغ و بہار مضامین اور ایک پھڑکتا ہوا مقدمہ ہے جو انھوں نے خود اپنے اوپر چلایا ہے تقریباً اتنے یا اس سے کچھ زائد مضامین اردو کے ممتاز رسائل کی جلدوں میں محفوظ ہیں جو "خاکم بدہن" میں جلوہ فگن ہوں گے۔

"چراغ تلے" کا کوئی بھی مضمون کمزور یا پھُس پھُسا نہیں ہے طنز و ظرافت کی کسوٹی اور فن کی جانچ پر یہ سب بلا کم و کاست پورے اترتے ہیں۔ اردو کی مزاحیہ نثر میں خوش قسمتی سے یہ پہلا مجموعۂ ظرافت ہے جس کو اس افضلیت اور برتری کا شرف حاصل ہے۔ پھر بھی ان کا بہاریہ مقدمہ "پہلا پتھر" اور مضامین میں "پڑیئے گر بیمار"، "تو نے پی ہی نہیں"، "یادش بخیر یا" "موذی" "سنہ"، "جنونِ لطیفہ" اور "آنا گھر میں مرغیوں کا" نہ صرف "چراغ تلے" کے شاہکار مضامین ہیں بلکہ اردو کی مزاحیہ نثر میں بھی شاہکار اور مستقل اضافے کا درجہ رکھتے ہیں، ہماری مزاحیہ نثر کی تاریخ میں یہ اضافہ بہت مبارک اور خوشگوار ہے۔

"پہلا پتھر" میں مشتاق احمد یوسفی کہتے ہیں:-

"فاضل مقدمہ نگار کا ایک پیغمبرانہ فرض یہ بھی ہے کہ وہ دلائل و نظائر سے ثابت کردے کہ اس کتابِ مستطاب کے طلوع ہونے سے قبل ادب کا نقشہ مسدس کے عرب جیسا تھا:

"ادب" جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا
جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا"

ادب کی اس نقشہ کشی اور تعریف کے ساتھ ہی مسکراہٹوں کے انار چھوٹنا شروع ہو جاتے ہیں۔ مقدمہ نگاری کی بدعت کا پوسٹ مارٹم کرنے میں یہ اپنے آپ کو بھی نہیں بخشتے۔ ان کے اس جملہ پر سر دُھنیئے:-

"خود ہمارے یہاں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں۔ جو محض آخر میں دُعا۔

مانگنے کے لالچ میں نہ صرف یہ کہ پوری نماز پڑھ لیتے ہیں بلکہ عبادت میں خشوع و خضوع اور گلے میں رُندھی رُندھی کیفیت پیدا کرنے کے لیے اپنی مالی مشکلات کو حاضر و ناظر جانتے ہیں۔"

مولانا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کے بارے میں ان کے ہمزاد کا یہ فقرہ پڑھیے :-

"...... اس کتاب میں سے مقدمہ نکال دیا جائے تو صرف سرورق باقی رہ جاتا ہے۔"

اپنا مقدمہ آپ لکھنے کی ان کی یہ تاویل بھی بہت ہی خوب ہے :-

" اپنا مقدمہ بقلم خود لکھنا کارِ ثواب ہے..... آدمی کتاب پڑھ کر قلم اٹھاتا ہے۔ ورنہ ہمارے نقاد عام طور سے کسی تحریر کو اس وقت تک غور سے نہیں پڑھتے جب تک انہیں اس پر سرقہ کا شبہ نہ ہو۔"

حساب میں فیل ہونے کے بارے میں فرماتے ہیں :-

"..... حساب میں فیل ہونے کو ایک عرصہ تک اپنے مسلمان ہونے کی آسمانی دلیل سمجھتا رہا۔"

حلیہ کے سلسلے میں شاید اس زحمت سے آپ بھی دوچار ہوں :-

" پیشانی اور سر کی حدِ فاصل اُڑ چکی ہے۔ لہذا منہ دھوتے وقت یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں۔"

کتوں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے :-

" بعض تنگ نظر اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمان کتوں سے بلاوجہ چڑتے ہیں حالانکہ اس کی ایک نہایت معقول اور منطقی وجہ موجود ہے۔ مسلمان ہمیشہ سے ایک عملی قوم رہے ہیں اور وہ کسی ایسے جانور کو محبت سے نہیں پالتے جسے ذبح کر کے کھا نہ سکیں۔"

"چراغ تلے" لکھنے اور اردو ظرافت کو آئندہ چراغاں کرنے کے سلسلے میں ڈرامائی کے طور سے کہتے ہیں :-

"جب میرا جی عمدہ تحریر پڑھنے کو چاہتا ہے تو ایک کتاب لکھ ڈالتا ہوں"

یہ ہے ان کھٹے میٹھے مضامین کی شانِ نزول۔

سادہ و پرکار طنز نگاری کے بارے میں کہتے ہیں ؎

رقص یہ لوگ کیا کرتے ہیں تلواروں پر

"زہرِ غم جب رگ و پے میں سرایت کرکے لہو کو کچھ اور تیز و تند و توانا کر دے تو نس نس میں مزاح کے شرارے پھوٹنے لگتے ہیں۔ عملِ مزاح اپنے لہو کی آگ میں تپ کر نکھرنے کا نام ہے۔ لکڑی جل کر کوئلہ بن جاتی ہے اور کوئلہ راکھ۔ لیکن اگر کوئلے کے اندر کی آگ باہر کی آگ سے تیز ہو تو پھر وہ راکھ نہیں بنتا، ہیرا بن جاتا ہے۔" مزاح کے بارے میں ان کا یہ نظریہ بہت توانا اور صالح ہے۔ اس پر مزاح نگاری میں یہ پورے طور پر کاربند بھی رہیں۔ اس پر ان کی یہ بات بھی بہت بھلی لگی کہ :-

"میرا یہ دعویٰ نہیں کہ ہنسنے سے سفید بال کالے ہو جاتے ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ پھر وہ اتنے برے نہیں معلوم ہوتے۔"

طنز نگاری کے بارے میں ان کے اس کلیئے سے بہتوں کا بھلا ہو سکتا ہے :-

"... جس شخص کو پہلا پتھر پھینکتے وقت اپنا سر یاد نہیں رہتا۔ اسے دوسروں پر پتھر پھینکنے کا حق ہی نہیں۔"

پتھراؤ کے آخر میں ثقہ اور "اسناب" قاری اور "ناقد" پر ان کے اس آخری پتھر کا بھی جواب نہیں :-

ان مضامین اور خاکوں کو پڑھ کر اگر کوئی صاحب نہ مسکرائیں تو ان کے حق میں یہ فالِ نیک ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب ہے کہ وہ خود مزاح نگار ہیں۔"

وہ مزاح نگار جو سادہ و پُرکار طنز کا قائل ہو۔ جسے تنے ہوئے رسے پر اترانے اور کرتب دکھانے کے بجائے تلواروں پر رقص کا فن آتا ہو، جس کی نس نس میں زہر غم کے سامنے سے مزاح کے شرارے پھوٹتے ہوں اور جو اپنے لہو کی آگ میں تپ اور نکھر کر ہیرا بنتا ہو۔ جس کے یہاں اصلاح اور آزادی کا منصب ہنسی اور خوش مذاقی ہو اس کے نظریہ ظرافت کو سمجھنا اس لئے بھی ناگزیر ہے کہ اس کی ظرافت کے سربفلک ایوان کی بنیاد اسی نظریہ پر تعمیر ہوتی ہے جس کو سمجھ لینے کے بعد ان کو سمجھنے اور ان کی ہنسی میں شریک ہونے میں قاری کو، اور ان پر قلم اٹھانے میں ان کے ناقد کو بڑی آسانی ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں وہ بغیر کسی دعویٰ کے کہتے ہیں :۔

"یہ کھٹ مٹھے مضامین طنزیہ ہیں یا مزاحیہ یا اس سے بھی ایک قدم آگے۔ یعنی صرف مضامین تو یہاں صرف اتنا عرض کرنے پر اکتفا کروں گا کہ وار ذرا اوچھا پڑے یا بس ایک روایتی آنچ کی کسر رہ جائے تو لوگ اسے بالعموم طنز سے تعبیر کرتے ہیں۔"

یوسفی کے یہاں طنز اور مزاح کا تصور بہت بلند ہے اس میں نہ جھلاہٹ ہے، اور نہ چلبلا پن نہ ثقالت۔ ان کی باوقار ظرافت میں سب سے نمایاں وصف ان کے لہجے کا دھیما پن ہے۔ ان کے اس توازن، رکھ رکھاؤ، شائستگی اور شرافت میں آپ کو ان کا نظریہ حیات، فلسفۂ حیات، مقصد اور موقف سب کچھ مل جاتا ہے۔

ان میں بڑی خوبی یہ ہے۔ یہ "کوریا" پر قلم نہیں اٹھاتے۔ اپنے طبقہ سے نیچے یا اوپر جانے اور اپنوں سے کترانے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ اپنے ماحول، اپنے گھر اور ارد گرد کی فضا میں سانس لیتے ہیں۔ ان کی اسی مقامیت میں وہ آفاقی شان ہے جو اردو کے علاوہ انگریزی یا دوسری زبانوں میں بھی بہت ہی کمیاب ہے۔ انگریزی یا فرانسیسی مزاح میں بھی اس کے زیادہ نمونے شاید آپ کو بھی نہ ملیں۔ دوسری زبانوں میں بھی نہ

مزاح نگاروں کی ریل پیل ہے نہ مزاح نگاری کے ایسے نمونے بالکل عام ہیں۔

"پڑیئے گر بیمار" کا شمار ہمیشہ یوسفی کے شاہکار مضامین میں ہوگا۔ اس میں فاضل مزاح نگار نے دراصل اپنی آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر پیش کیا ہے کہ محض اتفاقی سے معمولی طور پر بیمار ہو جانے کے بعد ان کو کس کس طرح بیماری سے زیادہ تیمارداری کو جھیلنا اور بھگتنا پڑا۔ عیادت کرنے والوں نے مفت کے مشوروں اور اندیشوں سے زندہ درگور کرنے کیلئے کیا کیا نہ کیا۔ پرسش احوال کے بہانے دوستوں اور عزیزوں کے علاوہ محبوب اور نرس تک نے گھیرا۔ جس سے ان پر کیا کچھ نہ گزر گئی۔ "پڑیئے گر بیمار" میں ان کی مزاح نگاری اور انشاء پردازی اوج کمال پر ہے۔ اس کے کچھ نمونے ملاحظہ فرمایئے:۔

"۔۔۔ انسان کو موت ہمیشہ قبل از وقت اور شادی بعد از وقت ہوتی ہے۔"

"۔۔۔۔ مارفیا کے انجکشن مریض کے بجائے مزاج پرسی کرنے والوں کے لگائے جائیں تو مریض کو بہت جلد سکون آجائے۔"

"محبوب عیادت کے بہانے غیر کے گھر جاتا تھا اور ہر سمجھدار آدمی اُسی امید میں بیمار پڑتا تھا کہ شاید کوئی بھولا بھٹکا مزاج پرسی کو آنکلے۔ مریض کو دنیا جہاں کے نسخے سمجھانے والوں کے بارے میں کہتے ہیں:۔

"میں آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کی اصل وجہ طبی معلومات کی زیادتی ہے یا مذاق سلیم کی کمی۔۔۔۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ننانوے فیصدی لوگ ایک دوسرے کو مشورے کے علاوہ اور دے بھی کیا سکتے ہیں۔"

بعض اوقات احباب اس بات سے بہت آزردہ ہوتے ہیں کہ میں ان کے مشوروں پر عمل نہیں کرتا۔ حالانکہ ان پر عمل پیرا نہ ہونے کا واحد سبب یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ میرا خون کسی عزیز دوست کی گردن پر ہو۔"

دواؤں کے بارے میں بھی سنیئے:۔

"جس طرح بعض خوش اعتقاد لوگوں کا ابھی تک یہ خیال ہے کہ ہر بدصورت عورت نیک چلن ہوتی ہے۔ اسی طرح طب قدیم میں ہر کڑوی چیز کو مصفّیٔ خون تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں انگریزی کھانے اور کڑوے قدح اسی امید میں نوشِ جان کیے جاتے ہیں۔"

ایک نیم حکیم خطرۂ جان سے ان کے مکالمات بھی سنیے:۔

پچھلی گرمیوں کا واقعہ ہے کہ میری بائیں آنکھ میں کوہانجنی نکلی تو ایک نیم جاں جو خود کو پورا حکیم سمجھتے ہیں، چھوٹتے ہی بولے:۔

"فم معدہ پر ورم معلوم ہوتا ہے۔ دونوں وقت مونگ کی دال کھائیے۔ دافعِ نفخ و تحلیلِ ورم ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "آخر آپ کو میری ذات سے کون سی تکلیف پہونچی جو یہ مشورہ دے رہے ہیں۔؟"

فرمایا۔ "کیا مطلب؟"

عرض کیا۔ "دو چار دن مونگ کی دال کھا لیتا ہوں تو اردو شاعری سمجھ میں نہیں آتی اور طبیعت بے تحاشہ تجارت کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اس صورت میں خدا نخواستہ تندرست ہو بھی گیا تو جی لے کیا کروں گا۔؟"

بولے "آپ تجارت کو اتنا حقیر کیوں سمجھتے ہیں؟ انگریز ہندوستان میں داخل ہوا تو اس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں ترازو تھی۔"

گذارش کی۔ "اور جب وہ گیا تو ایک ہاتھ میں یونین جیک تھا اور دوسری آستین خالی لٹک رہی تھی۔!"

بات انھیں بہت بری لگی۔ اس لیے مجھے یقین ہو گیا کہ سچ تھی اس کے بعد تعلقات اتنے کشیدہ ہو گئے کہ ہم نے ایک دوسرے کے لطیفوں پر ہنسنا چھوڑ دیا۔"

دوا علاج کے باب میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"مجھے اس پر قطعاً تعجب نہیں ہوتا کہ ہمارے ملک میں پڑھے لکھے لوگ خونی پیچش کا علاج گنڈے تعویذوں سے کرتے ہیں۔ غصہ اس بات پہ آتا ہے کہ وہ واقعی اچھے ہو جاتے ہیں۔"

ایک عیادت کرنے والے کی جھلک آپ بھی دیکھئے:-

"پچھلے ہفتہ کا ذکر ہے۔ ہلہلا کر بخار چڑھ رہا تھا کہ وہ آدھمکے۔ کپکپا کر کہنے لگے:۔

"بیماری آزاری میں بھی بڑی غیریت برتتے ہو، برخوردار! دو گھنٹے سے ملیریا میں چپ چاپ مبتلا ہو اور مجھے خبر تک نہ کی!"

بہتیرا جی چاہا کہ اس دفعہ ان سے پوچھ ہی لوں "قبلہ کونین! اگر آپ کو بر وقت اطلاع کرا دیتا تو آپ میرے ملیریا کا کیا بگاڑ لیتے۔؟"

یوں بھی اگر بخار سو ڈگری سے اوپر ہو جائے تو میں ہذیان بکنے لگتا ہوں جسے بیگم اقبال گناہ اور رشتے دار وصیت سمجھ کر ڈانٹتے ہیں اور بچے ڈانٹ سمجھ کر سہم جاتے ہیں۔ میں ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکا کہ یہ حضرت مزاج پرسی کرنے آتے ہیں یا پُرسا دینے۔"

اُن کی تقریر سننے کے بعد:۔

"بے اختیار جی چاہا کہ انھیں کے قدموں پر پھڑ پھڑا کر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دوں اور انشورنس کمپنی والوں کو روتا دھوتا چھوڑ جاؤں۔۔۔۔"

ایک قبر رسیدہ بزرگ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"ایک بزرگ جو اسّی سال کے پیٹے میں ہیں خیر و عافیت پوچھنے آئے اور دیر تک قبر و عافیت کی باتیں کرتے رہے۔۔۔ آتے ہی بہت سی دعائیں دیں جن کا خلاصہ یہ تھا کہ خدا مجھے ہزاری عمر دے تاکہ میں اپنے اور ان کے فرضی دشمنوں کی چھاتی پر روایتی مونگ دلنے کے لئے زندہ رہوں۔ اس کے بعد جانکنی اور فشار گور کا اس قدر مفصل حال بیان کیا کہ مجھے غریب خانے پر گورِ غریباں کا گمان ہونے لگا۔۔۔ میری جلتی ہوئی پیشانی

پر اپنا ہاتھ رکھا جس میں شفقت کم اور رعشہ زیادہ تھا اور اپنے بڑے بھائی کو (جن کا انتقال تین سال قبل اسی مرض میں ہوا تھا جس میں میں مبتلا تھا) یاد کرکے کچھ اس طرح آب دیدہ ہوئے کہ میری بھی ہچکی بندھ گئی۔ میرے لئے جو تین عدد سیب لائے تھے وہ کھا چکنے کے بعد جب انھیں کچھ قرار آیا تو وہ مشہور تعزیتی شعر پڑھا جس میں اُن غنچوں پر حسرت کا اظہار کیا گیا ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔

میں فطرتاً رقیق القلب واقع ہوا ہوں اور طبیعت میں ایسی باتوں کی سہار بالکل نہیں ہے۔ ان کے جانے کے بعد "جب لاد چلے گا بنجارا" والا موڈ طاری ہو جاتا ہے اور حالت یہ ہوتی ہے کہ ہر پرچھائیں بھوت اور ہر سفید چیز فرشتہ دکھائی دیتی ہے۔ ذرا آنکھ لگتی ہے تو بے ربط خواب دیکھنے لگتا ہوں۔۔۔۔

کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر میری لاش پر انجکشن کی پچکاریوں سے لڑ رہے ہیں اور لہو لہان ہو رہے ہیں۔ ادھر کچھ مریض اپنی اپنی نرس کو کلوروفارم سنگھا رہے ہیں۔ ذرا دور ایک لاعلاج مریض اپنے ڈاکٹر کو یاسین حفظ کرا رہا ہے۔ ہر طرف ساگو دانے اور مونگ کی دال کی کھچڑی کے ڈھیر لگے ہیں۔ آسمان بنفشی ہو رہا ہے۔ اور عناب کے درختوں کی چھاؤں میں، نیلوفر کی جھاڑیوں کی اوٹ لیکر بہت سے غلمان ایک مولوی کی غذا بالجبر کے طور پر معجونیں کھلا رہے ہیں۔ تاحدِ نظر کافور میں بسے ہوئے کفن ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ جا بجا لوبان سلگ رہا ہے اور میرا سر سنگ مرمر کی لوح مزار کے نیچے دبا ہوا ہے اور اس کی ٹھنڈک نس نس میں گھسی جا رہی ہے۔ میرے منہ میں سگریٹ اور ڈاکٹر کے منہ میں تھرمامیٹر ہے۔ آنکھ کھلتی ہے تو کیا دیکھتا ہوں کہ سر پر برف کی تھیلی رکھی ہے۔ میرے منہ میں تھرمامیٹر گھسا ہوا ہے اور ڈاکٹر کے ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہے۔"

"تو نے پی ہی نہیں" یوسفی کا بہت ہی لاجواب مضمون ہے۔ ہر چند کہ اس میں ایک آدھ جگہ یہ الفاظ سے کھیلے ہیں لطائف کو کھیلنے کی کوشش کی ہے۔ اور الفاظ و خیال کیے جا سکرا دبی کی ہے مگر اس کے باوجود بھی مضمون کے لاجواب ہونے میں تب بھی

کیا جا سکتا۔

کافی آپ کو کیسی لگتی ہے اور اس کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں۔ یہ بتانے سے زیادہ بہتر ہوتا۔ اس کے بارے میں آپ ان کی سنیئے، پھر کوئی رائے قائم کیجئے۔ یہ لطیفہ شاید آپ نے بھی سنا ہو:۔

"زندگی میں صرف ایک شخص ایسا ملا جو واقعی کافی سے بیزار تھا۔ لیکن اس کی رائے اس لحاظ سے قابلِ التفات نہیں کہ وہ ایک مشہور کافی ہاؤس کا مالک نکلا"۔

کج بحثی کا فلسفہ کس خوبی سے سمجھاتے ہیں:۔

"گرم ممالک میں بحث کا آغاز صحیح معنوں میں قائل ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ دانستہ دل آزاری ہمارے مشرب میں گناہ ہے۔ لہذا ہم اپنی اصل رائے کا اظہار صرف نشہ اور غصہ کے عالم میں کرتے ہیں۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ لیکن اگر یہ سچ ہے کہ کافی خوش ذائقہ ہوتی ہے تو کسی بچے کو پلا کر اس کی صورت دیکھ لیجئے"۔

اس جملے پر داد دیجئے:۔

"... بہر حال ثقافتی مسائل کا فیصلہ ہم بچوں اور بلیوں پر نہیں چھوڑ سکتے

یا ــــ

"ایسے اربابِ ذوق کی کمی نہیں جنہیں کافی اس وجہ سے عزیز ہے کہ یہ ہمارے ملک میں پیدا نہیں ہوتی ..."

شاید یہ لطیفہ آپ بھی سن چکے ہوں:۔

"مشرقی افریقہ کے (ایک انگریز افسر کی) کافی کی سارے ضلع میں دھوم تھی۔ ایک دن اس نے ایک نہایت پر تکلف دعوت کی جس میں اس کے حبشی خانساماں نے بہت ہی خوش ذائقہ کافی بنائی۔ انگریز نے بہ نظرِ حوصلہ افزائی اس کو معزز مہمانوں کے سامنے طلب کیا اور کافی بنانے کی ترکیب پوچھی۔ حبشی نے جواب دیا کہ بہت ہی سہل طریقہ ہے۔ بس بہت

سا کھولتا ہوا پانی اور دودھ لیتا ہوں پھر اس میں کافی ملا کر دم کرتا ہوں۔"

"لیکن اسے حل کیسے کرتے ہو۔ بہت مہین چھنی ہوتی ہے۔"

"حضور کے موزے میں چھانتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟ کیا تم میرے قیمتی ریشمی موزے استعمال کرتے ہو؟" آقا نے غضب ناک ہو کر پوچھا۔ خانساماں سہم گیا۔ "نہیں سرکار! میں آپ کے صاف موزے کبھی استعمال نہیں کرتا۔"

"یادش بخیر یا" ان پرانے نوجوانوں پر طنز ہے جو اپنی نوجوانی کی عینک سے بڑھاپے میں بھی دنیا کو دیکھ اور تک رہے ہیں۔ یوسفی کے ہیرو آغا تلمیذ الرحمٰن چاکسوی ان ماضی پرستوں کے نمائندے ہیں جن کے خیال میں ذیل کے تمام قابلِ ذکر واقعات ۲۵ سال پہلے ہو چکے ہیں ان کا کام زندگی کی چنگاریوں سے الاؤ بنانے کے بجائے ماضی کی راکھ کو کریدنا اور گذرے ہوئے زمانے کے اندھیروں میں بھٹکنا ہے۔ آغا ہر اعتبار سے ایک مکمل مزاحیہ کردار کی بہت اچھی جھلک ہے۔ ان سے آپ بھی ملیے:۔

"۔۔۔۔ سامنے دیوار پر آغا کی ربع صدی پرانی تصویر آویزاں تھی جس میں وہ سیاہ گاؤن پہنے، ڈگری ہاتھوں میں لیے یونیورسٹی پہ مسکرا رہے تھے۔"

"۔۔۔۔ آغا چابی دیتے، اور چھپن چھری اور بالم چھیلا بیا سے ولے کے گھسے گھسائے ریکارڈ سنتے (سننے میں کانوں سے زیادہ حافظے سے کام لیتے تھے۔)"

قدامت پرستوں پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"۔۔۔ ہمارے ہاں بعض محتاط حضرات کسی کے حق میں کلمہ خیر کہنا روا نہیں سمجھتے تا وقتیکہ ممدوح کا چہلم نہ ہو جائے۔"

آغا کی موٹر کا حال یہ تھا کہ "انجن بند ہو جانے کے سبب، کار زیادہ تیز چلتی تھی واقعی اس کار کا چلنا اور چلانا معجزۂ فن سے کم نہ تھا۔ اس لیے کہ اس میں پٹرول سے

زیادہ خون جلتا ہے۔ آغا دل ہی دل میں کڑھتے اور اپنے مصنوعی دانت پیس کر رہ جاتے....
وہ فی الواقع محسوس کرتے کہ ان کے لڑکپن میں گنّے زیادہ میٹھے اور ملائم ہوا کرتے تھے...
چنے ہرگز اتنے سخت نہ ہوتے تھے... بکری کا گوشت اب اتنا حلوان نہیں ہوتا جتنا
ان کے وقتوں میں ہوا کرتا تھا..... وہ ایک لمحے کو بھی یہ سوچنے کے لئے تیار نہ تھے کہ
اس میں دانتوں کا قصور یا آنتوں کا فتور بھی ہو سکتا ہے... جب قدرت نے ان کو دانت
اور چنے دونوں دیئے تھے تو انھوں نے دانتوں کو استعمال نہیں کیا لیکن جب دانت عدم
استعمال سے گر گئے تو انھیں چنوں کے سوندھے ہونے کا احساس ہوا۔"

کلجگ کا رونا روتے ہوئے آغا کہتے:۔

"بیس سال پہلے جنوری میں ایسی کڑاکے کی سردی نہیں پڑتی تھی، حتیٰ کہ پنج وقتہ
تیمم کرنا پڑے۔"

قدیم نصاب تعلیم کے بارے میں کہتے:۔

"ہمارے بچپن میں کتابیں اتنی آسان ہوتی تھیں کہ بچے تو بچے ان کے والدین بھی سمجھ
سکتے تھے۔" غرض مرزا نے اپنے آپ کو شوکت پاستان کے گنبد میں اسیر کر لیا تھا جہاں
سے وہ بالشتیوں کی دنیا پر تبھرا کرتے اور اس بات پر مُصر رہتے کہ "اب ہم تین قسطوں
میں بھی ایک بیٹھک نہیں لگا سکتے..." تین مصنوعی دانت تک ٹوٹ چکے۔" ماضی پرستی
اور روایت پرستی پر اس سے بہتر طنز کی مثال اردو میں نہیں ملتی۔

یوسفی نہ جانے کس رو میں "پہلوٹھی" کو پہلونٹی اور تنکلا کو "تنکھلا" لکھ گئے ہیں
لیکن مضمون کی زبان بہت صاف سادہ اور رواں ہے۔ "موزی" پڑھنے کے بعد آپ
کو ہنسی خوشی سگریٹ پینے کا سلیقہ آجائے گا۔ یوسفی نے اپنے ہمزاد مرزا عبدالودود بیگ
کی آڑ میں سگریٹ نوشی پر بڑی.... خیال انگیز انشاء پردازی کے جوہر دکھائے ہیں:۔

"ہم نے اکثر دیکھا کہ مرزا ہمیری لینے کو گئے اور آگ لے کر لوٹے۔"

"... وہ سگریٹ کے دھوئیں کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ صاف ہوا سے کھانسی اٹھنے لگتی ہے اور اگر دو تین دن تک سگریٹ نہ ملے تو گلے میں خراش ہو جاتی ہے۔"

"میں نے سگریٹ پینا اپنے بڑے بھائی سے سیکھا جب کہ ان کی عمر چار سال تھی۔"

"اس رفتار سے انھیں اب تک قبر میں ہونا چاہیئے۔"

"وہ وہیں ہیں۔!"

"کسی دانا نے سگریٹ کی کیا خوب تعریف کی ہے۔ ایک ایسا سلگنے والا بدبودار مادہ جس کے ایک سرے پر آگ اور دوسرے پر احمق ہوتا ہے۔"

"موذی" مشتاق احمد یوسفی کی طباعی، ذہانت، برجستگی اور مزاح نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ "سنہ" ایک ایسی مصیبت ہے جس سے ہر طالب علم گزرتا ہے۔ حالت یہ ہوتی ہے کہ سنہ یاد ہے تو واقعہ ذہن سے نکل گیا اور واقعہ حافظ میں رہ گیا تو سنہ کا پتہ نہ لگ سکا۔ اس خشک رٹائی سے موضوع سے دلچسپی کے بجائے وحشت پیدا ہوتی ہے۔ اس مسئلے پر انھوں نے بہت لطیف اور کامیاب طنز کیا ہے:-

"ایسے ایسے غبی لڑکے جو نادر شاہ درّانی اور احمد شاہ ابدالی میں کبھی تمیز نہ کر سکے اور آج تک چنگیز خاں کو مسلمان سمجھتے ہیں محض اس وجہ سے فرسٹ کلاس "آئے" کہ انھیں قتلِ عام کی صحیح تاریخ اور پانی پت کی حافظہ شکن جنگوں کے سن ازبر تھے۔ خود مرزا جو میٹرک میں اس وجہ سے اول آگئے کہ انہیں مرہٹوں کی تمام لڑائیوں کی تاریخیں یاد تھیں۔ برسوں تک اہلیہ بائی کو شیواجی کی رانی سمجھ بیٹھے تھے، میں نے ٹوکا تو چمک کر بولے:

"یعنی کمال کرتے ہیں آپ بھی! اگر شیواجی نے شادی نہیں کی تو نانا فرنویس کس کا لڑکا تھا۔؟"

جوانی کی راتیں مرادوں کے دن..... شاہجہاں کے چاروں لڑکوں کی لڑائیاں اور اس کے تلے اوپر اٹھارہ لویوں کے سن ولادت و وفات یاد کرنے میں بسر ہوا.....

برطانیہ کی تاریخ میں بھی چھ عدد جارج اور آٹھ آٹھ ایڈورڈ اور ہنری گذرے ہیں، جن کی پیدائش اور تخت نشینی کی تاریخیں یاد کرتے کرتے زبان پر کانٹے اور حافظے میں نیل پڑ گئے۔"

"مجھے سن یاد نہیں رہتا اور مرزا کو وہ واقعہ یاد نہیں رہتا جو اس سن سے متعلق ہو۔"

"جب بچے پڑھتے ہیں کہ سکندر ۳۵۶ ق.م میں پیدا ہوا اور ۳۲۳ ق.م میں فوت ہوا تو وہ اسے کتابت کی غلطی سمجھتے ہوئے استاد سے پوچھتے ہیں کہ یہ بادشاہ پیدا ہونے سے پہلے کس طرح مرا؟ استاد جواب دیتا ہے کہ پیارے بچو! اگلے وقتوں میں ظالم بادشاہ اسی طرح مرا کرتے تھے۔"

"جنونِ لطیفہ" میں فن کو جنون کی حد تک پہونچانے کی ذہنیت کا مذاق اڑایا گیا ہے کہ اس فن میں طاق باورچی کے پالے پڑنے کے بعد یہ درگت بنتی ہے :۔

"ایک دن ہم نے دیکھا کہ ان کا دیرینہ باورچی بھی ان سے لبے تبے کرکے باتیں کر رہا ہے، ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی، کیوں کہ شرفا میں یہ انداز گفتگو محض مخلص دوستوں کے ساتھ روا ہے، جہلا سے ہمیشہ سنجیدہ گفتگو کی جاتی ہے۔ ہم نے مرزا کی توجہ اس امر کی جانب دلائی" تو انھوں نے جواب دیا کہ میں نے جان بوجھ کر اس کو اتنا منہ زور اور بدتمیز کر دیا ہے کہ اب میرے گھر کے سوا اس کی کہیں اور گذر نہیں ہو سکتی۔"

"کچھ دن ہوئے ایک مڈل فیل خانساماں ملازمت کی تلاش میں آنکلا۔ آتے ہی ہمارا نام اور پیشہ پوچھا۔ میرے سابق خانساماؤں کے پتے دریافت کیے۔ نیز یہ کہ آخری خانساماں نے ملازمت کیوں چھوڑی؟ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے یہ وضاحت بھی کر دی کہ برتن نہیں مانجھوں گا۔ جھاڑو نہیں دوں گا۔ ایش ٹرے صاف نہیں کروں گا۔ میز نہیں لگاؤں گا۔ دعوتوں میں ہاتھ نہیں دھلاؤں گا۔" "جناب تنخواہ کی فکر نہ کیجئے۔ پڑھا لکھا آدمی ہوں کم تنخواہ میں بھی خوش رہوں گا۔" "پھر بھی؟" کہنے لگے" بچھتر روپے ماہوار ہوگی لیکن اگر سودا بھی مجھی کو لانا پڑا تو چالیس روپے ہوگی!"

" ان کے بعد جو خانساماں آیا، اس نے کہا کہ میں چپاتیاں بیٹھ کر پکاؤں گا، مگر برادے کی انگیٹھی پر، چنانچہ لوہے کی انگیٹھی بنوائی، تیسرے کے لیے چکنی مٹی کا چولہا بنوانا پڑا، چوتھے کے مطالبے پر مٹی کے تیل سے جلنے والا چولہا خریدا اور پانچواں خانساماں اتنے سارے چولہے دیکھ کر ہی بھاگ گیا۔"

" بعض نہایت قابل باورچیوں کو محض اس دور اندیشی کی بنا پر علیحدہ کرنا پڑا کہ آئندہ وہ کسی اور کا نمک کھا کر ہمارے حق میں پروپگنڈہ کرتے رہیں۔"

"ہم نے کہا کہ بھئی اور تو سب ٹھیک ہے مگر تم سات مہینے میں دس ملازمتیں چھوڑ چکے ہو۔ یہ کیا بات ہے؟"

کہنے لگے "صاحب! آج کل وفادار مالک کہاں ملتا ہے؟"

"۔۔۔ ہم نے دریافت کیا کہ بندۂ خدا یہ چپاتی ہے یا دسترخوان؟ تو ہنس کر بولے کہ وطن مالوف میں روٹی کے حدود اربعہ یہی ہوتے ہیں۔" "چارپائی اور کلچر" انکا سب سے خیال انگیز مضمون ہے۔ اس میں ان کی ذہنی پرواز، تہذیب، اقدار اور شعور کے بے پایاں ادراک سے قاری کے دل و دماغ میں خوشبوں کے انار چھوٹنے لگتے ہیں۔ چٹکلوں، گدگدیوں کے ساتھ طنز کی کسک اور مسرت کی لہریں اٹھتی رہتی ہیں۔ اس مضمون کے بغیر "اردو ادب" کا کوئی بھی انتخاب نامکمل ہی سمجھا جائے گا۔ اس کے بھی جستہ جستہ اقتباسات پڑھیئے اور لطف اٹھایئے:۔

"۔۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ پہلی بار، بان کی کھرّی چارپائی کی چرچراہٹ اور ادوان کا تناؤ دیکھ کر بعض نوارد سیّاح اسے سارنگی کے قبیل کا ایشیائی ساز سمجھتے ہیں۔"

منظرکشی کے سلسلے میں ان کا ایک پھڑکتا ہوا جملہ بھی پڑھیئے:۔

"۔۔۔۔ اور آم کے لیے گھنے درخت جن میں آموں کے بجائے لڑکے لٹکے رہتے ہیں۔"

اب چارپائی کے بارے میں سُنیئے :-

" چارپائی جس پر دن بھر شطرنج کی بساط یا رمی کی پھڑ جمی اور جو شام کو دسترخوان بچھا کر کھانے کی میز بنا لی گئی ..... یہ وہی چارپائی ہے۔ جس کی سیڑھی بنا کر سُگھڑ بیویاں مکڑی کے جالے اور چلبلے لڑکے چڑیوں کے گھونسلے اتارتے ہیں۔ اسی چارپائی کو وقت ضرورت پٹیوں سے بانس باندھ کر اسٹریچر بنا لیتے ہیں اور بجوگ پڑ جائے تو انھیں بانسوں سے ایک دوسرے کو اسٹریچر کے قابل بنایا جا سکتا ہے ..... اسی پر بیٹھ کر مولوی صاحب قمچی کے ذریعہ اخلاقیات کے بنیادی اصول ذہن نشین کراتے ہیں "

چارپائی کے پائے کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے :-

ہماری نظر سے خراد کے بنے ایسے سڈول پائے بھی گذرے ہیں جنہیں چوڑی دار پاجامہ پہنانے کو جی چاہتا ہے۔"

مباحثے اور مناظرے کے لیے سب سے بہتر جگہ چارپائی ہے۔ "بحث و تکرار کے لیے اس سے بہتر طرز نشست ممکن نہیں۔ کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ فریقین کو ایک دوسرے کی صورت نظر نہ آئے تو کبھی آپے سے باہر نہیں ہوتے۔ اسی بنا پر میرا عرصے سے یہ خیال ہے کہ اگر بین الاقوامی مذاکرات گول میز پر نہ ہوئے ہوتے تو لاکھوں جانیں تلف ہونے سے بچ جاتیں۔ آپ نے خود دیکھا ہوگا کہ لدی پھندی چارپائیوں پر لوگ پیٹ بھر کے اپنوں کی غیبت کرتے ہیں۔ مگر دل برے نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ سبھی جانتے ہیں کہ غیبت اسی کی ہوتی ہے جسے اپنا سمجھتے ہیں اور کچھ یوں بھی ہے کہ ہمارے ہاں غیبت سے مقصود قطع محبت ہے نہ گذارشِ احوال واقعی بلکہ محفل میں

لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

لوگ گھنٹوں چارپائی پر کسمساتے رہتے ہیں مگر کوئی اٹھنے کا نام نہیں لیتا۔ اس لئے کہ ہر شخص اپنی جگہ بخوبی جانتا ہے کہ اگر وہ چلا گیا تو فوراً اس کی غیبت شروع ہو جائے گی۔

چنانچہ پچھلے پہر تک مرد ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈالے بحث کرتے ہیں اور عورتیں گلے سے گال بھڑائے کچر کچر لڑتی رہتی... رہا یہ سوال کہ ایک چارپائی پر بیک وقت کتنے آدمی بیٹھ سکتے ہیں تو گذارش ہے کہ چارپائی کی موجودگی میں ہم نے کسی کو کھڑا نہیں دیکھا۔"

"لیکن چارپائی کی سب سے خطرناک قسم وہ ہے جس کے بچے کھچے اور ٹوٹے بانوں میں اللہ کے برگزیدہ بندے محض اپنی قوتِ ایمانی کے زور سے اٹکے رہتے ہیں۔ اس قسم کے جھلنگے کو بچے بطور جھولا اور بڑے بوڑھے آلہ تزکیہ نفس کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اونچے گھرانوں میں اب ایسی چارپائیوں کو غریب رشتے داروں کی طرح کونوں کھدروں میں آڑے وقت کے لیے چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ خود مجھے مرزا عبدالودود بیگ کے ہاں ایک رات ایسی ہی چارپائی پر گزارنے کا اتفاق ہوا جس پر لیٹتے ہی اچھا بھلا آدمی نون غنہ "ں" بن جاتا ہے۔

اس میں داخل ہو کر میں ابھی اپنے اعمال کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ یکایک اندھیرا ہوگیا جس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ ایک دوسرا ملازم اوپر ایک دری اور بچھا گیا۔ اس خوف سے کہ دوسری منزل پر اور کوئی سواری نہ آجائے میں نے سرے سے دری پھینک کر اٹھنے کی کوشش کی تو گھٹنے بڑھ کے پیشانی کی بلائیں لینے لگے۔ کھڑبڑ سن کر مرزا خود آئے اور چیخ کر پوچھنے لگے کہ بھائی آپ ہیں کہاں؟ میں نے مختصراً اپنے محلِ وقوع سے آگاہ کیا تو انھوں نے ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچا... اور میرے ساتھ ہی بلکہ مجھ سے کچھ پہلے چارپائی بھی کھڑی ہوگئی!

"میں یہ چارپائی اوڑھے لیٹا تھا کہ ان کی منجھلی بچی آنکلی۔ تتلا کر پوچھنے لگی:

"چچا جان! اکڑوں کیوں بیٹھے ہیں؟" بعد ازاں سب بچے مل کر اندھا بھینسا کھیلنے لگے بالآخر ان کی امی کو مداخلت کرنا پڑی۔

"کمبختو! اب تو چپ ہو جاؤ! کیا گھر کو بھی اسکول سمجھ رکھا ہے؟

اب چارپائی کے بارے میں ان کے خیالات بھی سنئے:۔

...ہمارے ہاں ایک اوسط درجے کے آدمی کی دو تہائی زندگی چارپائی پر گذرتی ہے

اور بقیہ اس کی آرزو میں! بالخصوص عورتوں میں زندگی اسی محور کے گرد گھومتی ہے جو بساطِ محفل بھی ہے اور مونسِ تنہائی بھی۔ اس کے سہارے وہ تمام مصائب انگیز کر لیتی ہیں۔ خیر مصائب تو مرد بھی جیسے تیسے برداشت کر لیتے ہیں مگر عورتیں اس لحاظ سے قابلِ ستائش ہیں کہ انہیں مصائب کے علاوہ مردوں کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔"

آخر میں اپنی چارپائی کے بارے میں انکشاف کرتے ہیں:۔

"ذرا کروٹ بھی بدلیں تو دوسری چارپائی والا کلمہ پڑھتا ہوا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ اگر پاؤں بھی سکیڑیں تو کتے اتنے زور سے بھونکتے ہیں کہ چوکیدار تک جاگ اٹھتے ہیں۔

"اور آنا گھر میں مرغیوں کا" یوسفی کے نزدیک مرغیوں کا صحیح مقام پیٹ اور پلیٹ ہے"۔ ان کے نزدیک" میزبان کے اخلاص کا اندازہ مرغیوں اور مہمانوں کی تعداد اور ان کے تناسب سے" ہوتا ہے۔ مرغیوں کے بارے میں صفائی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ

"میرا مطلب یہ نہیں کہ میں یہ امید لگائے بیٹھا تھا کہ میرے دہلیز پر قدم رکھتے ہی مرغ سرکس کے طوطے کی مانند توپ چلا کر سلامی دینگے یا چوزے میرے پاؤں میں وفادار کتے کی طرح لوٹیں گے اور مرغیاں اپنے اپنے انڈے" سپردم بتو مایۂ خویش را" کہتی ہوئی مجھے سونپ کر الٹے قدموں واپس چلی جائیں گی...."

مرغ کی آواز کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ" اس کی جسامت کے لحاظ سے کم از کم سوگنا زیادہ ہوتی ہے.... اگر گھوڑے کی آواز بھی اسی تناسب سے بنائی گئی ہوتی تو تاریخی جنگوں میں توپ چلانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔"

مرزا نے ان سے پوچھا" مرغ اذان کیوں دیتا ہے؟" جواب دیا اپنے رب کی حمد و ثنا کرتا ہے" کہنے لگے" صاحب! اگر یہ جانور واقعی اتنا عبادت گذار ہے تو مولوی اسے اتنے شوق سے کیوں کھاتے ہیں؟"

مرغیوں کے بارے میں اس غلط فہمی میں ہرگز نہ رہیئے کہ بہ اپنے ڈربے یا ٹاپے میں

رہتی ہیں۔ مرغیاں ڈربے کے سوا ہر جگہ نظر آتی ہیں اور جہاں نظر نہ آئیں، وہاں ان کے ورود و نزول کا ناقابلِ تردید ثبوت چھوڑ جاتی ہیں ان آنکھوں نے بارہا غسل خانے سے انڈے اور کتابوں کی الماری سے جیتے جاگتے چوزے نکلتے دیکھے، لحاف سے کڑک مرغی اور ڈربے سے شیو کی پیالی برامد ہونا روزمرہ کا معمول ہوگیا۔ اور یوں بھی ہوا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور میں نے لپک کر ریسور اٹھایا۔ مگر میرے ہیلو کہنے سے پہلے ہی مرغ نے میری ٹانگوں کے درمیان کھڑے ہو کر اذان دی اور جن صاحب نے ازراہِ تلطف مجھے یاد فرمایا تھا۔ انھوں نے "سوری! رانگ نمبر! کہہ کر جھٹ فون بند کر دیا۔"

مُرغ کی لڑائی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "وہ دن بھر پڑوسیوں کے مرغوں سے فی سبیل اللہ لڑتا اور شام کو مجھے لڑاتا تھا۔"

"**کرکٹ**"۔ یوں تو آج کل ہر وہ بات جس میں ہارنے کا امکان زیادہ ہو کھیل سمجھی جاتی ہے۔ "کھیل اور کام یا کھیل کو کام اور کام کو کھیل بنانے کے بارے میں کہتے ہیں "پولو انسان کے لئے کھیل ہے اور گھوڑے کے لئے کام" کھیلوں کے سائنٹفک ہونے کے بارے میں شاید یہ آپ بھی تسلیم کرلیں کہ رمی کے ساتھ سائنٹفک ہونے میں اس لئے شبہ نہیں کہ "کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ روپیہ ہارنے کا اس سے زیادہ سائنٹفک طریقہ ہنوز دریافت نہیں ہوا۔ لیجئے یہ ثابت ہوا کہ کرکٹ اور رمی قطعی سائنٹفک ہیں۔"

"ترقی یافتہ ممالک میں یہ رجحان عام ہے کہ تعلیم نہایت آسان اور تفریح روز بروز مشکل ہوتی جاتی ہے (مثلاً بی اے کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے مگر برج سیکھنے کے لئے عقل درکار ہے) لہٰذا بعض غبی لڑکے کھیل سے جی چرا کر تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دینے لگے ہیں اس سے جو سبق آموز نتائج رونما ہوئے وہ سیاست دانوں کی صورت میں ہم سب کے سامنے ہیں۔"

مرزا کے میچ دیکھنے کا نقشہ دیکھئے:۔

"تازہ اخبار سے چھتری کا کام لیتے، خود نہیں پڑھتے۔ انہیں پیچھے بیٹھنے والے

بار بار صفحہ الٹنے کی درخواست کرتے رہتے ......"

ان کے ہمزاد کا کھیل بھی دیکھئے کہ زیر دنات آؤٹ رہنے پر بھی ان کی کیا درگت بنی :-

دوسرے ہی اوور میں بولرنے گیند ایسی کھینچ مار ی کہ مرزا کے سر سے ایک آواز (اور منہ سے کئی!) نکلی اور ٹوپی اڑ کر وکٹ کیپر کے قدموں پر جا پڑی۔ جب ایمپائر نے مرزا کو ٹوپی پہنانے کی کوشش کی تو وہ ایک انچ تنگ ہو چکی تھی!"

"صنفِ لاغر" کے بارے میں یوسفی کے تجربات خاصے وسیع معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "گھوڑے اور عورت کی ذات کا اندازہ اس کی لات اور بات سے کیا جاتا ہے"۔

"...ہر لڑکی کا بیشتر وقت، اپنے وزن اور شوہر سے جنگ کرنے میں گذرتا ہے"۔

یوسفی نے "صنفِ لاغر" میں حسن وصحت کے غلط معیار اور اقدار پر شدید طنز کیا ہے۔ موٹاپا، ہوا خوری، نسوانی حسن کے تصور کا مذاق بڑے دلچسپ طریقہ سے اڑایا ہے:

"......دُبلے ہونے کی خواہش جتنی عام ہے اتنی ہی شدید بھی۔ آئینے کی جگہ اب وزن کرنے والی مشین نے لے لی ہے۔ عورتوں کی قسمت کے خانے میں صرف ان کا وزن لکھا ہوتا ہے۔ عورتوں کو وزن کم کرنے کی دواؤں سے اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی ادھیڑ مردوں کو یونانی دواؤں کے اشتہاروں سے ...... چہل قدمی دُبلے کو موٹا اور موٹے کو دُبلا کرتی ہے"۔

"موسموں کا شہر" میں انھوں نے اپنے شہر کے بدلتے ہوئے موسم اور موسمی ہائے ہائے کا مذاق اڑایا ہے۔ کوئی خرابی ایسی نہیں جس کا ذمہ دار آب وہوا کو نہ ٹھہرایا جاتا ہو (حالانکہ اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کو خرابی صحت کی وجہ سے موسم خراب لگتا ہے) موسم کے تلوّن کی یہ کیفیت ہے کہ دن بھر کے تھکے ہارے پھیری والے شام کو گھر لوٹتے ہیں تو بغیر استخارہ کئے یہ فیصلہ نہیں کرسکتے کہ صبح کو اٹھ کر بھوبھل کی بھُنی گرما گرم مونگ پھلی بیچیں یا آئس کریم!"

"کاغذی ہے پیرہن" میں تجریدی آرٹ اور جدید مصوری میں ایک انچ کی جو کسر رہ جاتی ہے

اس کو انھوں نے ہدف بنایا ہے۔ جس کا نچوڑ یہ ہے:" خالی خولی خلوص سے کام نہیں چلنے
کا۔ بچھو بڑے خلوص سے ڈنک مارتا ہے اور بجری نہایت خلوص سے میاتی ہے لیکن ہم اسے
فن نہیں کہتے ..... فن ضبط اور ٹھہراؤ کا متقاضی ہے فن ریاض چاہتا ہے فقط دل چیر کر
دکھانا کافی نہیں۔"

آخیر میں مجھے اس حسنِ تکرار کی جانب بھی اشارہ کرنا ہے جو کرارے کرنسی نوٹوں"
اور"غیر ملکی جاسوس" وغیرہ کے بار بار استعمال کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے مترادفات
اور الفاظ سے جا بجا کھیلنے کی کوشش اور لطائف کے بے جا استعمال سے بچنا چاہیے۔
لیے پرہیز نہیں کرتے کہ بے عیب ذات خدا۔ اس کے علاوہ باوجود سخت چھان بین کے
ان کے یہاں کوئی خاص خامی نہ تلاش کر پایا البتہ اس بہانے ان کی بہت سی خوبیاں
میرے سامنے آگئیں جن کا میں کھلے دل سے اعتراف کرتا ہوں کیونکہ اس سے میری نظر میں
اردو ظرافت کی توقیر کچھ اور بڑھ گئی۔

ہزل گوئی لکھنؤ میں

ہزل بھی ظرافت کا ایک رنگ ہے۔ یہ رنگ مدہم بھی ہو سکتا ہے اور شوخ بھی اس میں پھکڑ، جگت، پھبتی، تفنن، ہجو اور عریانی کا بھی دخل ہو سکتا ہے۔ طنز و تعریف، بذلہ سنجی، مزاح اور شوخی بھی جلوہ گر ہو سکتی ہے!

ہزل کو مزاحیہ غزل کا بھی نام دیا جا سکتا ہے۔ غزل کی طرح ہزل میں بھی حکایت یار گفتن کے ساتھ ساتھ شیخ و ناصح سے چھیڑ چھاڑ، شکوۂ بے بال و پری، آشوبِ زمانہ، حاکم، رقیب اور آسمان سے بے زاری کا اظہار سیاستِ درباں، موسم اور مہنگائی پر چھینٹے ہوتے ہیں ـــــ

غزل کی طرح ہزل کا بھی منزل بہ منزل ارتقا ہوا ہے۔ اس میں بھی ادب اور زندگی کی تحریکات اور رجحانات، بدلتے ہوئے حالات اور زمانے کا عکس ملتا ہے۔

ہزل میں ظرافت کس پایے کی ہو گی، لطیف ہو گی یا کثیف، یہ ہزل گو کے ذوقِ تربیت، ذہنی شعور، نفاستِ طبع، حسِ مزاح، شئے لطیف، مطالعہ، مشاہدہ، ذہانت ادراک اور عرفان پر منحصر ہے۔

ہزل کا سلسلہ بے ہودگی، مسخرگی سے بھی مل سکتا ہے، طباعی اور لطافت سے بھی!

ہزل ہنسی کی ترجمان ہے۔ مگر یہ کہنا مناسب نہ ہوگا کہ یہ محض تفریحِ طبع کا ذریعہ ہے ہزل کے پردے میں کام کی باتیں بھی کی جا سکتی ہیں۔ ہنسی ہنسی میں فکر میں توازن پیدا کیا جا سکتا ہے اور عدمِ توازن کا احساس بھی دلایا جا سکتا ہے۔ چٹکیاں بھی لی جا سکتی ہیں اور

گدُ گدُایا بھی جا سکتا ہے۔ اگر ہزل گو، ہزل پر اپنے فن کے سارے ساز و سامان صرف کرتا ہے۔ اور موضوع، جو محض خام مواد ہے، اس کو گڑھنے، سنوارنے اور بنانے میں صنعت کاری سے کام لیتا ہے۔ اگر محنت اور سنجیدگی سے فن پارہ تخلیق کرتا ہے تو پڑھنے اور سُننے والا بھی اسے سنجیدگی سے پڑھتا اور سُنتا ہے۔ اگر ہزل گو نے کسی بے آہنگی کو بار دگر تخلیق کر کے دلچسپ سے دلچسپ تر بنا دیا ہے۔ اگر ادبی، فنی اور تخلیقی باریکیوں کے پل صراط سے ہزل گو کامیابی اور توازن کے ساتھ گزر گیا ہے تو اس کا فن پارہ مزاحیہ ادب اور اس کی تاریخ میں اپنی جگہ بنا لے گا اور اس کے خالق کی وہی مقبولیت اور عزت و تکریم ہوگی جو کسی بھی کامیاب فن کار کا خاصہ ہوا کرتی ہے۔ سو اس سے عوام اس سے اسی طرح لطف اندوز ہوں گے جیسے کسی بھی مزاحیہ فن پارے پر خندہ زن ہوتے !

اُردو ہزل گو اس نکتے سے پورے طور پر آشنا نہیں۔ کیونکہ اردو میں ہزل کی روایت سینہ بہ سینہ فارسی سے آئی ہے۔ فارسی ادبیات میں سعدیؔ، انوریؔ، قاآنیؔ، نعمت خان عالیؔ، سوزنیؔ اور شفائیؔ وغیرہ نے ہزل کے جو نمونے پیش کئے ہیں، ان کا رنگ بہت تیز اور انداز غیر متوازن ہے مثلاً ؎

زر بہ امرد کسے دہد بہ گزاف
کہ نہ داند شریعت زردُشت
ہر کجا سرو قامتے بینی
چشم در دے کن و خیو درمشت
چوں نہ کونش دری و شلوار
بے گناہ ست کسے نہ خواہد کشت — سعدیؔ
روزے از بہر تماشا سوئے دشت
چند زن بیروں شُدند از مہتراں

چوں نہ صحرا ساعتے ماندند دیر
چند خر دیدند در صحرا چراں
نر خرے بر مادہ خر رغبت نمود
بر مثالِ عاشقاں با دلبراں
با عمودے یک گز و نیم آبنوس
گادنی میکرد بر رسم خراں
گہ فروے بردے گہ برمے کشید
تیز مے افگند و میکرد عاں دعاں
زاں زناں یک زن براں گادند بدید
برکشید آہے و گفت اے خواہراں
گر جماع نیست کیں خرے کند
برکس ما مے رید ایں شوہراں — انوری

جلاب مرا بہ مفت نتوانی برد
گر سام تریمانی و گرستم گرد
یا قیمت انچہ خوردہ باید داد
یا در عوض انچہ ریدہ باید خورد — شفائی

لیکن رودکی کمال اسمٰعیل خلاق المعانی اصفہانی، حافظ اور خسرو نے اس میں توازن اور اعتدال پیدا کیا۔ پھر بھی فارسی ہزلیات کا عام مزاج ان سے ہم آہنگ نہ ہوسکا کمال کہتے ہیں ؎

دِے مرا گفت دوستے کہ مرا
با فلاں خواجہ از پے ددسہ کار

سُخنے چند ہست داد از پئے آن
خلوتے مے ببایدم ناچار
خلوتے آن چُنان کہ اندر وے
ہیچ مخلوق را نباشد بار
گفتم این فرحت از توانی یافت
وقت نان خوردنش نگہ مے دار

ساقیا برخیز و دردہ جام را
خاک بر سر کُن غمِ ایام را ——— حافظ

زبانِ شوخ من ترکی و من ترکی نمے دانم
چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہانِ من ——— خسرو

فارسی ہزل کے اثر سے اردو میں بھی یہ بے راہ روی بہت عام رہی ___

لکھنؤ کی ہزل گوئی پر فارسی اور شعرائے دہلی کا براہِ راست اثر پڑا۔ اس لئے اس عدمِ توازن میں لکھنو دہلی سے بھی سبقت لے گیا اور ہزل، مزاحیہ غزل کے مقابلے میں ہجو، تمسخر اور پھکڑ سے زیادہ قریب رہی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ لکھنؤ میں ہزل کے پردے میں محض ظرافتِ کثیف سے طبیعت بدمزہ کی گئی ہو۔ اس میں جا بجا ذہانت کی چنگاریاں بھی ہیں اور شوخی و شگفتگی کی گل کاریاں بھی!

میر و سودا، میر سوز و میر ضاحک، انشا و مصحفی، آتش و ناسخ اور ان کے تلامذہ نے ہزل کو بطور تفنن برتا۔ معرکہ آرائیوں میں اس سے کام لیا۔ دبستانِ لکھنؤ کی ہنگامہ آرائیوں میں اسے تلوار اور ڈھال کے طور پر استعمال کیا گیا۔ جس کی وجہ سے اس کا رنگ تو ضرور نکھر آیا۔ مگر اس کی فنی نزاکت اور ادبی رکھ رکھاؤ ماند پڑ گیا۔

اساتذۂ دہلی نے لکھنؤ میں ہزل جس رنگ میں پیش کی، ان میں میر، سودا،

میر سوز، میر ضاحک، انشا اور مصحفی وغیرہ خاص طور پر قابلِ غور ہیں ۔

اچپلاہٹ اس کی سب معلوم ہے

معرکوں میں چوک کے اک دھوم ہے —— میر

صورت ملی دد کی زباں کو کرو گے کیا

گو ہم سے تم نے صحبتِ شب کی چھپائی بات

★

ہوا جاتی رہی وعدوں ہی ہیں تو شکِ نہائی کے

جو اب بھی ہو مل کر تو جاڑا ہے دولائی میں —— سودا

تو کہتا ہے کہ بس بس چوچنچ بند کر

دفا لایا ہے دت تیری دفا کی

یار آتا ہے ترے یار کہ ایسی تیسی!

آزما تا ہے ترے پیار کی ایسی تیسی —— میر سوز

چشم بد دُور شیخ جی صاحب

کیا ازار آپ کی اٹنگی ہے ——

ہیں روزِ حُسن سے وہ نہایت گھمنڈ پر

نام خدا نگاہ بڑے کیوں نہ ڈنڈ پر —— انشا

★

چالیس برس کا ہے چالیس ہی کے لائق

تھا مردِ معمر کہیں دس بیس کے لائق —— مصحفی

★

کہتے ہیں ذکرِ لیلٰے دمجنوں جو چھیڑیئے

چپ رہیئے بس نہ قبر کے مُردے اُکھیڑیئے —— آتش

لکھنؤ میں ہزل کی ابتدا اسی رندی، سرمستی اور چھیڑ چھاڑ سے ہوئی۔ اس خارزار ہزل میں ابتذال بھی ہے اور فحش گوئی بھی، شوخی بھی ہے اور طباعی بھی!

لکھنؤ میں ہزل کا پہلا دور جس رنگِ ظرافت کی غمازی کرتا ہے، وہی بے راہ روی بعد کے ظریف شعرائے کے یہاں بھی کم و بیش عام ہے۔ رشک، حزیں، اُمید، افسر، اسرار، آس، احسان، اسد، تصوّر، حریف، خنداں، ذکی، رستم، زیرک، سوختہ، قمر، کوثر، ماجد، شوخ، نظر، وفا، واہ، چناں، زسیٹر، ظراف اور غٹ غوں وغیرہ کا کلام اس کی اچھی مثال ہے۔ ان شعرائے کے یہاں ہزل کے اچھے نمونے بھی مل جاتے ہیں، لیکن زیادہ تر اعتدال کی کمی اور عدم توازن کی وجہ سے ان میں لطافت اور ذہانت مفقود ہے۔ ان شعرائے کے کلام کے ہر طرح کے نمونے بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

چاول الماس گوشت لختِ جگر
فرقتِ یار میں پلاؤ نہیں ——— رشک

★

پہنا گلے میں تم نے جو پھولوں کا ہار ہے
سمدھن تمہارے حسن پہ کیا ہی بہار ہے ——— حزیں

★

آج کل ہے کچھ سنیچر پاؤں میں
مُفت کا رہتا ہے چکر پاؤں میں
عشق میں اک آسماں رفتار کے
آگیا ہے سر کا چکر پاؤں میں ———
میں جو کچھ بگڑا تو شامت آئے گی
وہ جو بگڑیں گی قیامت آئے گی ——— اُمید امیٹھوی

★

چپکے سے کان میں سنو، پردے کی بات ہے
یہ پردہ وردہ کچھ نہیں، سب واہیات ہے ——— افسر میرٹھی

★

ان کے لب سے جو رال بہتی ہے
اس کو کہتا ہوں قند کا شیرا ——— اسرار

★

میاں مجنوں نے اے احسان سنتے ہیں کہ رحلت کی
صفاچٹ ہو گیا میدان صحرائے محبت کا ——— احسان

★

نہ پائی نوکری جب میم صاحب نے تو فرمایا
چلو مس خاک اڑائیں چل کے یورپ کے بیاباں کی

★ ——— اسد علی قدوائی

رو کے کہتے ہیں کہ عید آ گئی اب سربر ظریف
آپ لا دیجئے زربفت کی پاپوش مجھے

★ ——— لالہ شیام لال ظریف

میں اک ساز ہوں مگر الٹے طریق کا
وہ چھیڑنے لگا تو میں خاموش ہو گیا

★ ——— خنداں لکھنوی

اے ذکی گر گئیں نزلہ سے جوان کی پلکیں
نظر آنے لگا بے خار گلستاں مجھ کو ——— ذکی

★

ہم نے سر ڈھانکا . انھوں نے نیل ہم کو کر دیا
اب وہ ہم پر، اور ہم اُن پر خون کا دعویٰ کریں ——— رسمؔ

★

خشک سالی میں نہ رکھ سوختہؔ اُمید پلاؤ
پس گئے سینکڑوں اس آس میں دیا ہو کر ——— سوختہؔ

★

مسٹر فلپ جو آتا تو کھٹّس ہوتا ہم بہت
جب باپ ملنے آئے تو سرمانے مانگتا!
جاہل پہننے مانگتا پاجامہ لوگ کو
ہم پر جب اور سوٹ کو سلوانے مانگتا

★ ——— قمرؔ (ہاف صاحب)

ہمارا اور تیرا ساتھ کیا ہوگا بھلا واعظ
تیرے قدح میں کیا زمزم ہے مرے کلہڑ میں تاڑی ہے ——— کوثرؔ

★

لطف دیتا ہے مرا وصل میں شاداں ہونا
اور اس شوخ کا رہ رہ کے پشیماں ہونا ——— ماجدؔ

★

بوسہ لینے سے خفا ہوتے ہیں کیوں مشفقِ من ؟
بوسہ وہ شے ہے کہ دونوں کو مزا ملتا ہے ——— مقصودؔ

★

عشق کم بخت نے دونوں کو بنایا پاگل
وہ سڑی ہو گئے، میں ہو گیا دیوانہ جُدا ——— نظرؔ

کمر پر ہاتھ رکھ کر جب کمیٹی میں کھڑے ہوں گے
پکاریں گے کہ آؤ قوم کو ہم یاد کرتے ہیں ——— وفا

★

بنایت شان سے میخانہ میں آیا کل اِک واعظ
بغل میں بوریا تھا، کان میں مسواک تھی ہاتھوں میں بدھنا تھا!

★ ——————— واہ

نہ تو اچھے ہیں نہ بیمار ہیں آپ
نہ ہیں اس پار نہ اُس پار ہیں آپ

★

تھک گئے ہیں، لیٹے ہیں یار ہم
کب سے بیٹھے ہیں بس دلدار ہم

★

یہ مجنوں پوچھتا تھا ساربان سے
میاں یہ اونٹ تم لائے کہاں سے؟
ہے اس کے در پہ سب بانکوں کا مجمع
چلے گی آج لاٹھی پاسباں سے

★ ——— چناں (انو صاحب جلیس)

کیا بتائیں حسرتیں کس کس جگہ ہیں جاگزیں
دل کے اوپر، دل کے نیچے، دل کے اندر، دل کے پاس

★ ——— سید باقر حسین زبیر

صدا یہ دیتے ہیں وہ ختم اب جوانی ہے
خریدو گاہکو سودا، دکان بڑھانی ہے

محاورہ ہے یہ کتنا فصیح سُنیے گا
ذرا سا کیوں میاں بھشتا مشک میں پانی ہے

★ شیخ نور محمد ظرافؔ

دنیا مرے نظارۂ حسرت کی بدل جائے
نیفے سے اگر ان کا کمر بند نکل جائے

★ غٹ غوں

رشکؔ اور حزیںؔ سے ظرافؔ اور غٹ غوں وغیرہ تک جس قسم کا کلام ملتا ہے اس کے نرم گرم نمونے اوپر پیش کئے گئے ہیں۔ ان میں سنبھلا ہوا انداز بھی ہے اور فحاشی و عریانی بھی کوشش یہی کی گئی ہے کہ مختلف قسم کے رنگ سامنے آجائیں۔ ان میں غزل اور ریختی کے عناصر ہیں۔ انگریز پر پھبتی ہے۔ اصلاح کی لہر ہے۔ محبوب سے چھیڑ چھاڑ ہے۔ بے جا تقلید مغرب کا مذاق ہے۔ واعظ پر فقرے ہیں، تفریح ہے اور لُطفِ زباں بھی ہے!

لکھنؤ میں ہزل کا دوسرا دَور" اودھ پنچ" سے شروع ہوتا ہے اور سرپنچ کے ظریفوں پر ختم ہوتا ہے۔" اودھ پنچ" اور اس کے معاصر پنچوں میں جس قسم کی ہزلیں ملتی ہیں، ان کا نمائندہ اور نمایاں رنگ" اودھ پنچ" میں مل جاتا ہے۔" اودھ پنچ کی ہزلوں میں جہاں روایتی رنگ و آہنگ ملتا ہے وہاں اس دور کا آب و رنگ بھی مل جاتا ہے۔ اس میں مغرب کے خلاف جہاد، علی گڈھ تحریک، سرسید اور اُن کے رفقاء، نوابینِ لکھنؤ، ترکِ موالات، انگریز پرستی اور غلامی کے خلاف آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ کانگرس، تحریکِ آزادی، ہوم رول" ہندوستان چھوڑ دو"، کالے قانون وغیرہ کی مخالفت۔ اور موافقت میں ایک عظیم الشان سرمایہ ہے جس میں ہماری سیاسی، معاشی، علمی، ادبی، صحافتی، تہذیبی ثقافتی اور مذہبی زندگی، قومی تحریکات اور رجحانات پر ذہنی خسزانہ" اودھ پنچ" کی جلدوں کی شکل میں محفوظ ہے۔ اس میں افراط و تفریط بھی ہے۔ اور کام کی باتیں بھی ہیں۔ ان کی چھاپ ہماری ہزل پر بھی

بہت نمایاں ہے۔

"اودھ پنچ" کے ان شہواروں میں منشی سجاد حسین، اکبر، رتن ناتھ سرشار، ستم ظریف، شہباز، برق، ہجر، ظریف، عثمانی، ریاض، حکیم ارادت سمیع، صفدر مرزاپوری وصل، ایم آر۔ بیگ، تبسم، فدائے سخن، نکتہ چین، لاابالی، الانسان ضاحک، پیٹنٹ، ٹریڈ مارک، ٹھیکو پرشاد، جوئندہ یابندہ، ستم مولوی، ضیغم، مولوی ا۔ ح۔ م۔ ع، مقروض شاعر اور ہائے والے وغیرہ ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

پیٹنٹ، ٹریڈ مارک اور جوئندہ یابندہ وغیرہ جیسے فرضی اور قلمی ناموں کے پیچھے اس زمانے کے ممتاز اہلِ قلم نہاں تھے۔ جو بعض نزاکتوں اور مصلحتوں کی بنا پر کھل کر سامنے نہیں آنا چاہتے تھے۔ دوسرے ان فرضی ناموں کی آڑ میں انھیں کھل کر کھیلنے کی آزادی مل جاتی تھی۔ ان کی ہزلوں کے بھی نمونے ملاحظہ فرمایئے ؎

سپردم انھیں مایۂ خویش را

وہ جانیں حساب کم و بیش را

عزیز و حق تعالے کبریا ہے

شرف جس نے عداوت کو دیا ہے!

منشی سجاد حسین

★

مری تقریر کا اس مس پہ کچھ قابو نہیں چلتا

جہاں بندوق چلتی ہے وہاں جادو نہیں چلتا

★

قاصد ملا جب ان سے وہ کھیلتے تھے پولو

خط رکھ لیا یہ کہہ کر اچھا سلام بولو

★

جب کہا میں نے کہ پیار آتا ہے مجھ کو تُم پر
ہنس کے کہنے لگے اور آپ کو آتا کیا ہے

★

نجد میں بھی مغربی تعلیم جاری ہو گئی
لیلےٰ و مجنوں میں آخر فوجداری ہو گئی ـــــ اکبر

★

کھیٹاں وہ کھا کے رات کو فقرے سے ٹل گئے
افسوس مفلسی میں مرے دو ڈبل گئے

★ ـــــ رتن ناتھ سرشار

وہی محبوب بھٹیاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے
وہی لہنگا، وہی ساری جو آگے تھی وہ اب بھی ہے

★ ـــــ ستم ظریف

تیور سے آشکار کہ پیسوں پہ ہے نگاہ
آئے نہ کچھ خیال بھی گو خلق ہو تباہ ـــــ برق

★

دو ہفتے سے مرے گھر میں وارد رمضان ہیں
جھلّے یہ کچھ ایسے ہیں کہ سب ان سے بے جان ہیں ـــــ شہباز

★

ضیا اخبار اور بازارِ سخن کی بانگی
اس کو کیا سوجھی کہ اس نے ادھلی میں سر دیا ـــــ شوق

★

مہنگا کر آٹا اور سستی کر افیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ـــــ ہجر

★

نفع اتنا تو ہوا اس میڈیکل کالج سے

تیرے بیمار کے پینے کو دوا آتی ہے

★

علم میں جھینگر سے بڑھ کر کامراں کوئی نہیں

چاٹ جاتا ہے کتابیں امتحاں کوئی نہیں

★

دلیلِ کم سنی اب اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی؟

کہ جوڑا پاؤں میں اس شوخ کے لٹکا آتا ہے

★ ـــــــ ظریف لکھنوی

چھوڑ کر ہم نے امیری، فقیری کی اختیار

بوریے پر بیٹھے ہیں قالین کو ٹھوکر مار کے ـــــ عثمانی

★

اک ٹیپ ماری زور سے زاہد کے اے ریاضؔ

اب ہاتھ مل رہے ہیں کہ اچھی پڑی نہیں ـــــ ریاضؔ

★

روکیے دستِ جفا روکیے ورنہ اک دن

ٹڑوں ٹوں پھریے گا عشاق کے مر جانے سے

★ ـــــــ حکیم ارادت سمیع

سمجھ کر مٹی کا بوا میرا دِل توڑ ڈالا ہے

بڑے ہی ننھے منے ہیں بڑے ہی بھولے بھالے ہیں

★ ——————— صفدر مرزا پوری

ہاتھ میں ہاتھ لئے غیروں کا پڑتے پھرتے ہو

ہم جو دامن چھوئیں تو آپ جھٹکتے جاویں

★ ——————— وصلؔ

اُٹھنے لگے جمنا سے بُخارات سودیشی

لو ہونے لگی ہند میں برسات سودیشی

★ ——————— ایم، آر، بیگ

جس کو لے لے کے مزے کھاتے ہیں ان کو عاشق

غم نہ کہیئے اسے، وہ آم کی چٹنی ہو گا

★ ——————— تبسّم

اشرفی سے تو یوں نِکاح ہوا

پر بندھا مہر ایک پائی کا

★ ——————— نکتہ چین

غیر کو بدھیاں پہنائی جائیں

ہم گئے گذرے ایک چھلّے سے

★ ——————— فدائے سخن

تصویرِ یار ہم نے لگائی دماغ میں

کچھ کچھ شبِ فراق طبیعت بہلتی ہے

★ ——————— پیٹنٹ

اچھا تو اپنا حال نہ کل تھا، نہ آج ہے
برسات آئی پھر وہی گر تا بڑ مزاج ہے

★ ——————— ٹریڈ مارک

اے بتِ کافر تری چالوں سے اکثر ہند میں
آتا جاتا ہے برابر زلزلے پر زلزلہ

★ ——————— م۔ع

چشمِ بد دُور واہ کیا کہنا
میں نے دیکھی ہے داغ کی صورت

★ ——————— مقروض شاعر

یہ خبر سن کر کوئی گھر سے ہمارے چل دیا
میرے ذمہ ان کی باقی کچھ مزدوری رہ گئی

★ ——————— ہائے وائے

"اودھ پنچ" کے اس رنگ پہ بعد میں "سرپنچ" نے جلا کی۔ "اودھ پنچ" کے پرانے نامہ نگار اور ظریف سرپنچ کے گرد جمع ہونے لگے تھے۔

جب شوکت تھانوی نے "سرپنچ" کو چمکایا تو نئے اور پرانے سب ہی ظریف ان کے گرد جمع ہو گئے۔

"سرپنچ" کے ظریفوں میں شوکت تھانوی کے علاوہ آسی، نسیم، انہونوی امین سلونوی، جلال ملیح آبادی، فرقت کاکوروی، مجنوں لکھنوی، ماچس لکھنوی، بزم، ملا حضوری، شوخ، شرف اور حاذل لکھنوی کی ہزل گوئی کے باب میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ اس دور میں شوکت تھانوی کے بعد فرقت، ماچس، اور مجنوں کی حیثیت میر کارواں کی ہے۔

"سرپنچ" کے میرِ کارواں شوکت تھانوی تھے۔ ان کا کلام "اودھ پنچ" کی زعفران زار شاعری کی یاد تازہ کر دیتا ہے ؎

جھکا دی تھی گردن یونہی میں نے رسماً
وہ سچ مچ اٹھا لائے خنجر چنانچہ

★

جنت میں کیا جانے کیا کر رہے ہیں!
نہ وہ دیکھتے ہیں نہ ہم دیکھتے ہیں

★

چھپا رہے ہو محبت، مگر خبر بھی ہے
ذخیرہ بازی کی اس عہد میں سزا کیا ہے

★

آدمیت کا ان میں نام نہیں
جن کی آنکھوں میں لگام نہیں

★

ہم نے چاہا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد
وہ بھی کمبخت ترا چاہنے والا نکلا

★

"سرپنچ" کے دور میں شوکت تھانوی کے بعد اُن کے استاد مولانا عبدالباری آسی بھی اس رنگ میں جواب نہیں رکھتے ؎

اختلافِ مذہبی جس وقت پیدا ہو گیا
اتحادِ قوم چوں چوں کا مربہ ہو گیا

"سرپنچ" کے دوسرے لکھنے والوں کے رنگ بھی دیکھئے

سینکڑوں کو وہ ٹانگ دیتے ہیں

ان کو پھانسی مگر نہیں ہوتی!

★ ——————— نسیم انہونوی

غالب کی پوچھیئے تو مقولہ ہے ان کا

اِک گونہ بے خودی دن رات چاہیئے

★ ——————— ایمن سلونوی

ظالم نے میرے رونے پہ ہو ہو کے بدحواس

کچھ ایسا مُنہ بنایا کہ ہنسنا پڑا مجھے

★ ——————— فرقت کاکوردی

کبھی اُوپر ہیں ہم، کبھی نیچے

خوب ہیں دہر کے نشیب و فراز

★ ——————— جلال ملیح آبادی

خدا بخشے یہ پہلے "آدمی" تھا

اب اک چکنا گھڑا سا ہوگیا ہے

★ ——————— مجنوں لکھنوی

واہ ری قسمت، واہ رے دور

مہنگا آٹا، سستا خُون!

★ ——————— ماحیں لکھنوی

سُنا ہے میں نے تمہیں اب وہ کاٹ کھاتے ہیں

یہی سزا ہے رقیبوں کے مُنہ لگانے کی

★ ——————— بزم

وہ طمانچہ پڑا گرانی کا

دل غریبوں کا بلبلا اٹھا

★ ——————— ثمرؔ

یہ کوئی کھیل نہیں ہے ذرا خیال رہے

دیا ہے دل جو تمہیں کرنے امتحاں کیلئے

★ ——————— شوخؔ

ساغر لئے ہوئے کبھی مینا لئے ہوئے

آتا ہے روز ایک تماشا لئے ہوئے

★ ——————— شرفؔ لکھنوی

"اودھ پنچ" اور "سرپنچ" کے دور کے بعد دورِ حاضر کے ہزل گو شعرائے کرام سامنے آتے ہیں لکھنؤ میں، اس دور میں رنگینؔ لکھنوی، عطاؔ لکھنوی، ماچسؔ لکھنوی مشتاقؔ پردیسی، آفتابؔ لکھنوی، تنکاؔ باردو خانوی، مجنوںؔ لکھنوی، جھنجھٹؔ لکھنوی ناوکؔ لکھنوی، نرکلؔ لکھنوی، انجرؔ لکھنوی، وحشیؔ لکھنوی، بے ڈھبؔ لکھنوی سرپٹؔ لکھنوی، مسٹرؔ لکھنوی، راکٹؔ محمود آبادی، واہیؔ آسیؔ، سگارؔ لکھنوی، شاکرؔ جردلی ظرفؔ لکھنوی، فیضؔ آرزدئی، جویاؔ لکھنوی، جعفر ملیح آبادی، دیمکؔ لکھنوی، نیرنگؔ لکھنوی تکلفؔ لکھنوی، ٹسؔ لکھنوی، اور انقلابیؔ لکھنوی وغیرہ ہیں۔

باقیات الصالحیات میں رنگینؔ لکھنوی اور عطاؔ لکھنوی کی حیثیت تبرک کی سی ہے۔ یہ تبرک بھی دیکھئے ۔۔

بغیر اب تو عینک کے ایک دوسرے کو

نہ وہ دیکھتے ہیں، نہ ہم دیکھتے ہیں!

★ ——————— رنگینؔ

عشاق نے جب دیکھا چپل کی دُکانوں کو
فوراً انھیں یاد آئے بھولے ہوئے افسانے

★ ——————— عطاؔ

ماچس لکھنوی، آفتاب لکھنوی اور مشتاق پردیسی کی اس لئے بھی اہمیت ہے کہ اس دور میں یہ بڑے مقبول اور معروف ہیں۔ ماچس بہت کہنہ مشق ہیں۔ اساتذہ میں ان کے یہاں زبان بہت آب دار ہے۔ یہ خالص لکھنوی رنگ کے نمایندے ہیں ؎

ان کی محبت کا قانون
کر گیا بالکل گوں متھون

آفتاب لکھنوی کو ظرافت ورثے میں ملی ہے۔ یہ اکبرؔ الہ آبادی کے نواسے ہیں شہرت اور مقبولیت کے ساتھ ان کے یہاں فطری شوخی اور ذہانت بھی ہے ظرافت میں آمد ہے۔ ان کا بھی نمونہ دیکھئے ؎

جھنجھلا کے میں نے کرتا زبر کا پہن لیا
جب کچھ علاج تنگیٔ داماں نہ ہو سکا

تنکا بارود خانوی کہنہ مشق شاعر ہیں اور خوب کہتے ہیں ؎

بڑھتی ہوئی مہنگائی کا پھر کیا کریں شکوہ
جب آپ کو اپنا ہی وچن یاد نہیں ہے

★

موجودہ لکھنؤ کا عام رنگ بھی اب ملاحظہ فرمایئے ؎

ہوا ہے جو اس کا چھاپنا کیا چھپے گا وہ جو ہوا نہیں ہے
ہے قومی آواز نام اس کا، کبھی جو سچ بولتا نہیں ہے

★ ——————— ظریف لکھنوی

یہ دوستی کے نام سے گلے میں ہاتھ ڈال کے
گلا نہ یوں دبائیے، مری زبان نکل پڑے

★ ——— نادک

نرم اب بھی نہیں ہیں ہم انجم
کر کراہٹ ہے خستہ حالی میں

★ ——— انجم

رُخ جانبِ مے خانہ لاحول ولا قوۃ
اور نام ہے مولانا لاحول ولا قوۃ

★ ——— بے ڈھب

کیا بات ہے کوچہ جاناں کی نکڑ سے ہی دل بھر آیا میرا
درباں سے لپٹ کر روتے ہوئے اُس بُت سے شکایت کر کے!

★ ——— راکٹ

کوئی دعوت کی جو فہرست کہیں بنتی ہے
سب سے پہلے کسی لیڈر ہی کا نام آتا ہے

★ ——— دائی آسی

اماں یہ ایرے غیرے جانیں کیا کیا چیز ہے اُلفت
محبت کی خلش کو صرف اہلِ دل سمجھتے ہیں

★ ——— ظرف

نہیں ہے فکر میری لاش اٹھانے کی
عزیز ڈھونڈھتے ہیں کنجیاں خزانے کی

★ ——— جویا

لکھنؤ میں ہزل گوئی کا موجودہ دور اس اعتبار سے اچھا ہے کہ اس میں ہر رنگ کے کہنے والے موجود ہیں۔ نئے اور پرانے تقاضے پورے ہونے کے ساتھ ارتقار کی رفتار بہت حوصلہ افزا ہے۔

موجودہ دور میں ہزل، فحاشی اور عُریانی سے دامن تقریباً چھڑا چکی ہیں۔ اس کا ادبی رنگ دا ہنگ شوخی اور متانت میں کچھ مزید توازن چاہتا ہے تاکہ لطیف ادبی ظرافت پروان چڑھ سکے!

لکھنؤ میں ہزل گوئی کے نمونوں کی جانب محض مختصر اشارے ہی کئے جا سکے ہیں۔ یہ لکھنؤ کی ہزل گوئی کی محض ایک سرسری جھلک ہے۔ بے جا طوالت کے خوف سے بہت سے اچھے نمونے پیش نہ کئے جا سکے۔ اس کے باوجود جو کچھ آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے اس کی بنا پر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ میں ہزل گوئی کا مستقبل تابناک ہے!

شوق بہرائچی

شوق کا نام آتے ہی ذہن میں ان کی تصویر ابھر آتی ہے۔

انتہائی دھان پان، رعشہ دار جسم، چہرے پر جھرّیاں، اندر کو دھنسی ہوئی بے رونق آنکھیں، الجھے ہوئے سفید بال، دمہ دار کھانسی سے سانس کا زور بوسیدہ شیروانی اور پاٹ دار پاجامہ، پیروں میں برائے نام چپل۔

بجلی چمک رہی ہو، ٹوٹ کر پانی گر رہا ہو، کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہو یا قیامت کی لو چل رہی ہو مگر شوق ہیں کہ پیٹ کے دوزخ کو پاٹنے کیلئے ہانپتے کانپتے مشاعروں میں چلے جا رہے ہیں۔

غرض مفلسی، ضعیفی، دمہ دار کھانسی نے نحیف و نزار شوق کو بہت جلد صاحب فراش کر دیا۔

بہرائچ گیا معلوم ہوا کہ شوق بیمار ہیں۔ عیادت کے لئے گیا، دیکھ کر دل بھر آیا، کھانستے کھانستے دہرے ہوئے جا رہے تھے۔ بات کرنے کے لئے بار بار سانس بحال کرنے کی کوشش کرتے اور بے حال ہو جاتے۔ مکان کیا تھا ایک چھپر کے گرد شکستہ سی چہار دیواری تھی۔ مکانیت کم تھی اور آبادی زیادہ۔ اس میں تیمار دار بھی تھے اور پردہ دار بھی۔ چارپائی کے جھلنگے میں شوق مفلسی اور بے چارگی کا نوحہ بنے انگو چھا لپیٹے اندر کو دھنسے ہوئے تھے۔ جھلنگا زمین سے کچھ ہی اونچا ہی تھا۔ انھوں نے بڑی شفقت سے مجھے پلنگ کی پٹّی پر بٹھایا" ان کے چاروں طرف شاگرد، عقیدت مند اور احباب مضمحل اور مودب بیٹھے ہوئے تھے۔ بیاض پر پوسٹ کارڈ رکھے لکھنے کی کوشش کر رہے تھے مگر رعشے کی وجہ سے قلم نہ ٹھہرتا۔ جنبش

کے تقاضے کے لئے کھانسی اور رعشے کے عالم میں کارڈ لکھنے کی بے بسی اور قیامت مجھ سے نہ دیکھی گئی۔ اجازت چاہی۔ گلے لگا کر بولے۔

"بس اب چل چلاؤ ہے۔" عرض کیا۔

"انشاءاللہ جلد اچھے ہو جایئے گا۔"

"خدا حافظ۔!"

"خدا حافظ۔!"

آنسو پوچھتا ہوا چلا آیا۔ دو ایک دن بہرائچ میں رہا مگر دوبارہ جانے کی ہمت نہ پڑی۔

شوق بڑے زود رنج تھے ذرا سی بات پر مہینوں روٹھے رہتے اور خوش ہو جاتے تو خوب کھل جاتے۔ بتاتے کہ کن کن مشاعروں میں گیا یا جانا ہے، اشخاص حالات اور واقعات پر تبصرے کرتے، ادبی بحثیں چھیڑتے۔ لطیفے سناتے، بیچ بیچ میں کھانستے جاتے سانس کا زور ہوتا تو سجدے میں چلے جاتے۔ نمک کی کنکری چاٹتے۔ رفتہ رفتہ باتیں کم ہوتی گئیں اور کھانسی بڑھتی گئی۔ چہرے اور ہاتھ پاؤں پر ورم چڑھنے لگا آنکھیں ڈوبنے لگیں، دو قدم چلنا محال ہو گیا۔ اس حال میں بھی مشاعروں سے واپسی پر قرض خواہ گھیر لیتے کسی کو ادا کرتے، کسی سے وعدہ کرتے اور کسی کے سلام پر جواب میں سلام یا عیادت کرنے والوں سے چوکھٹ پر ملتے اور کہتے "بھئی تشریف رکھیے میرے یہاں تو یہی چوکھٹ صوفے کا کام دیتی ہے۔"

احباب عقیدت مند اور شاگرد جب دیوان چھپنے پر اصرار کرتے تو ٹالنے کے لیے کہتے۔

"مجموعہ حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دے رہا ہوں۔ ذرا "م" کی ردیف پوری ہو جائے۔"

اور شوق صاحب ۱۳ر جنوری ۱۹۶۴ء بروز اتوار صبح ۶ بجے "م" کی ردیف

مکمل کئے بغیر دنیا سے سدھار گئے۔ انھوں نے ۸۰ سال کی عمر پائی۔ پس ماندگان میں اپنی بیوہ کے علاوہ دو لڑکے اور دو لڑکیاں چھوڑیں۔

سید ریاست حسین نام شوقؔ تخلص۔ والد کا نام سید سلامت علی تھا۔ شوقؔ ۱۸۹۴ء میں محلہ سید واڑہ، اجودھیا (ضلع فیض آباد) میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، مدرسہ کی ابتدائی تعلیم کے بعد ہی فکر معاش دامنگیر ہوئی۔ مختلف ملازمتیں کرنے کے بعد ۱۹۱۹ء میں بہرائچ آئے اور ریاست نواب گنج علی آباد میں نواب نوازش علی خاں کی سرکار سے وابستہ ہو گئے۔ یہ سلسلہ بھی جلد ختم ہو گیا۔ اور کچھ عرصہ کیلئے بہرائچ میونسپل بورڈ میں ہو گئے۔

شوقؔ کی سنجیدہ اور پھر مزاحیہ شاعری کی مقبولیت کے باوجود مالی مشکلات کا سلسلہ جاری رہا۔ کھانسی نے بڑھ کر دمہ کی شکل اختیار کر لی اور مسلسل بیمار رہنے لگے۔

مشاعروں سے بھی بسر نہ ہوتی تو لوگوں کے ہاتھ روپیہ آٹھ آنے میں غزلیں فروخت کر دیتے۔ ان غزلوں سے لوگ مشاعرے لوٹتے، رسائل و اخبارات میں چھپوا کر داد پاتے اور مجموعہ کلام کی زینت بناتے۔ شوقؔ رسائل و اخبارات میں کلام چھپوانے سے گھبراتے اور کہتے "یہی کام میرا ذریعہ معاش ہے اگر یہ اخباروں رسالوں کے ذریعہ عام ہو جائے تو پھر مجھے کوئی مشاعروں میں کیوں بلوائے گا۔؟" رسائل و اخبارات کے مدیر مشاعروں میں جو کچھ نوٹ کر لیتے وہی کلام کبھی کبھار نظر آ جاتا۔

عمر کے آخری حصے میں اپنا ایک مکان بھی بنوا لیا تھا اور چھپنے سے کرایہ کے مکان سے اٹھ کر اس میں آ گئے تھے۔ اس زمانے میں دمہ کے زور کے ساتھ ہاتھ میں رعشہ بھی ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے لکھنے میں بڑی زحمت ہوتی ورنہ شوقؔ اپنے زمانے کے اچھے خوش نویس بھی تھے۔ فروخت کلام کے علاوہ عقیدت مند بھی سلوک کر دیتے تو دو تین سال سے ریاستی حکومت نے ۶۰ روپے ماہوار "ادبی پنشن" بھی مقرر کر دی تھی۔ مگر سب مل ملا کر بھی اس

مہنگائی میں ان کے کنبے کیلئے کسی طور پر بھی کافی نہ ہوتا۔

شوق کو بچپن سے شاعری کا شوق تھا۔ ابتدا میں مولوی قربان حسین سے مشورہ سخن کیا مولوی صاحب کا سلسلہ میر انیس سے ملتا ہے اس اعتبار سے شوق انیس اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔ شوق انیس تو نہ بن سکے مگر حالات نے ان کو ضاحک ضرور بنا دیا۔

ان کی شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی، عرصہ تک مشاعروں کی طرح میں غزل کہتے رہے اس دوران شوق جس مقامی سیاستدان یا رئیس سے خفا ہو جاتے ہیں اس کی ہجو ضرور کہتے جوا حباب میں بہت مقبول ہوتی چنانچہ دوستوں کے اصرار اور غزل کی یکسانیت سے اکتا کر شوق نے آنسوؤں کے بازار میں قہقہوں کا بیوپار شروع کیا اور ۱۹۳۰ء میں پہلی بار سنی وقف بورڈ کے طرحی مشاعرے میں اپنا مزاحیہ کلام پیش کیا جو بہت پسند کیا گیا ان کا یہ شعر بار بار پڑھوایا گیا ؎

یہاں ہر چیز اب میراث اپنی سمجھی جاتی ہے
یہاں جو وقف ہوتا ہے علی الاولاد ہوتا ہے

اس کے بعد ان کی مقبولیت کا یہ عالم ہو گیا کہ ان کے بغیر ہر مشاعرہ پھیکا سمجھا جاتا۔ شوق کی شاعری کی عمر ۵۰ سال ہے جس میں شروع کے ۱۶ برس غزل اور ہجو کہتے رہے اور بعد کے آخیر ۳۴ برسوں میں طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کی، اس طرح ان کی شاعری کے دو دور ہوئے۔

پہلا دور ۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۰ء تک (غزل اور ہجو)
دوسرا دور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۶۴ء تک (طنزیہ اور مزاحیہ)

شوق نے ظرافت میں اپنا رنگ سب سے الگ نکالا، انھوں نے غزل کو طنز و مزاح کے لطیف سانچے میں ڈھال کر اس میں نشتریت، تلخی اور سادگی بھر لی۔ جہاں صحت مند قہقہے لگائے وہاں زندگی کے مسائل و مصائب کی شرح بھی تبسم زیر لب سے کرتے رہے

ان کی شاعری ابتذال، پھکڑ، تمسخر اور بدمذاقی سے پاک ہے۔ ان کے لہجے میں شدت سنجیدگی اور وقار ہے۔ انھوں نے ہمارے مزاحیہ ادب کے ستھرے مذاق کی سطح بلند کی اس کو نئی وسعتوں اور نئے امکانات سے ہم آہنگ کیا۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے پرانی نسل سے تعلق رکھنے کے باوجود نئے زمانہ اور حال پر نظر رکھی۔ اسی وجہ سے ان کے یہاں طبقاتی شعور اور سیاسی وسماجی ناہمواری کا احساس ملتا ہے۔

شوق الفاظ کے اچھے نباض اور کاریگر ہیں۔ ان کے فن اور آرٹ کا ایک حسن یہ بھی ہے کہ ان کے کسی شعر کے پہلے مصرعے پر شبہ نہیں ہوتا کہ شعر مزاحیہ ہوگیا مگر دوسرے شعر میں انگوٹھی کے نگینہ کی طرح ایک لفظ ایسا جڑ دیتے ہیں جس سے شعر طنزیہ، مزاحیہ ہوجاتا ہے یہ ان کی انفرادیت بھی ہے اور خوبی بھی کہ ایک لفظ کے اضافے سے قہقہوں کے گلاب مہک اٹھیں متوازن قہقہہ اور مہذب مسکراہٹ کی یقیناً یہ ایک اچھوتی مثال ہے۔

شوق ظرافتِ شعری کے مستند استاد تھے۔ حسن وفن کی باریکیوں پر ان کی گہری نظر تھی۔ الفاظ کے دروبست اور اظہار و بیان پر انھیں پوری قدرت تھی۔ انھوں نے فن کے ساتھ پورا خلوص برتا۔ اسی وجہ سے ان کے اشعار میں ہمیں شدت احساس اور خلاقانہ کرب کی مخصوص کیفیت ملتی ہے۔ اس شعر میں دیکھیے انھوں نے روایتی شاعری پر کیا بھرپور طنز کیا ہے۔ یہ شعر نزاکت احساس، لطافت بیان، ندرت خیالی اور چٹخارہ زبان کا کتنا حسین پیکر ہے ؎

یہ کون آکے تصور میں پاس بیٹھ گیا
خدا کی مار ہو انگلی کچل گئی میری

یہ شعر شوق کے حسبِ حال ہے ؎

انسان کو اب دن بھر کھانا نہیں ملتا
مدت سے ہے فرد کشی ہیا رمضان اور ہے توبہ

شوق سمجھتے ہیں کہ سماج میں ایک مفلس کی کیا قدر وقیمت ہے اس مفہوم کو انھوں نے اس شعر میں کس حسن و خوبی سے ادا کیا ہے ؎

زمانہ یوں میرے سائے سے دور رہتا ہے
کہ جیسے کاٹ ہی کھائے گی مفلسی میری

مفلسی کے لئے زندگی نہیں مرنا بھی ایک پرابلم ہے اس پر ان کی مشہور نظم "مجھے معلوم نہ تھا" کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے ؎

قطع ہوجائے نہ کیوں سیر چمن کی امید
نہ رہی ممکن ہے نہ ہے درِ عدن کی امید
گور ہی کا ہے ٹھکانا نہ کفن کی امید
اس گرانی میں مروگے مجھے معلوم نہ تھا

جب پینشن ملنے میں بہت دیر ہوئی اور سرکاری طبی امداد باوجود وعدے کے میسّر نہ ہوسکی اور شوق توجہ دلاتے دلاتے تھک گئے تو انھوں نے جاں کنی کے عالم میں ریاستی وزیر انصاف سید علی ظہیر کو شکایتاً، یہ آخری قطعہ بھیجا تھا۔

سانس پھولے گی کھانسی سوا آئے گی
لب پہ جانِ حزیں بارہا آئے گی
دارِ فانی سے جب شوق اٹھ جائے گا
تب مسیحا کے گھر سے دوا آئے گی

شوق نے بہت سے شعری تجربے بھی کئے اور اردو شاعری کو جدید بحریں بھی دیں انھوں نے اپنی اس تجرباتی بحر کا نام "بحر شیر خوار" رکھا تھا۔ نمونہ دیکھئے ؎

خارزار ارے واہ — پُر بہار ارے واہ
وہ نگاہ کرم — ہفتہ دار ارے واہ

بے وفا کو یہ دل   پھر ادھار ارے واہ

مختصراً شوقؔ کی طنزیہ شاعری میں ان کی نظمیں ان کی غزلوں سے زیادہ آبدار نوکیلی اور جگر کے پار ہونے والی ہیں۔ "خوددار پلاؤ"، "دعوت" "بریانی" "روٹی" "مجھے معلوم نہ تھا" اور "بہار" وغیرہ نہ صرف بہت مشہور ہے بلکہ ہمارے مزاحیہ ادب میں ان کی حیثیت مستقل اضافے کی سی ہے۔

منتشر کلام کے علاوہ شوقؔ نے دو غیر مطبوعہ دیوان "طوفان" اور "ہیجان" بھی چھوڑے ہیں اور اس کے علاوہ ان کا کلام "اودھ پنچ" اور "سرپنچ" کی جلدوں میں بھی محفوظ ہے۔

ذیل میں شوق کے کچھ اشعار آپ بھی پڑھیئے اور لطف اُٹھائیے

بجلی کی روشنی میں چلے آیئے کلیم !
کھمبے ہیں راستے میں ید بیضا لیے ہوئے

★

یہ عضو نامناسب نہیں ترے اے دوست
بلینک درس میں قدرت نے شاعری کی ہے

★

اتنی زبان ہند کی آسان ہو گئی   ہم بے نیاز منت قاموس ہو گئے

★

مشرق پہ بھی نظریں ہیں مغرب پہ بھی نظریں ہیں
ظالم کے تخیل کی لمبان ارے توبہ

★

یہاں کیوں آکے ٹھہریئے اہل شام ودروم اے ساقی
یہ میخانہ ہے یا ہے کوئی ویٹنگ روم اے ساقی

★

دوڑی ہوئی ہے آپ کے چہرے پہ سیاہی
نام آپ کا مہتاب ہے معلوم نہیں کیوں

نہ دے ساقی مجھے کچھ غم نہیں ہے
یہ کلہڑ کوئی جامِ جم نہیں ہے

نظر آتے ہیں جو قطرے گلوں پر
کسی کی رال ہے شبنم نہیں ہے

اَب کی ناکام رہا قائدِ ملک و ملت
اَب کی بربادئ اقوام کا ٹھیکہ نہ ملا

بزمِ ادب میں آئینہ بزمِ طور ہے
لوگ آرہے ہیں ہاتھ میں جوتا لئے ہوئے

سکوں شاید ہے پیدا ہونے والا
حکومت کی توجہ حاملہ ہے

واعظ کو بھی اب شکوہ ہے بے بال و پری کا
اُڑتا نہیں ہے مرغِ مسلم کئی دن سے

اللہ رکھے زاہد صد سالہ کو قائم
اک یہ بھی ہیں منجملۂ آثارِ قدیمہ

ہم زندوں سے مردے بہتر رہنے کا کہیں امکان تو ہے
ہم ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں انکے لئے قبرستان تو ہے

یہاں پر اہلِ فن کی قدر بعدِ مرگ ہوتی ہے
یہاں ہر ایک دعویٰ خارج المیعاد ہوتا ہے

حاجی لق لق کی عیدیاں

یاد ش بخیر! کبھی عیدی میں بھیجے جانے والے کارڈوں پر ہنٹر والی مس سلوچنا، ٹارزن اور گاما پہلوان کی تصویریں ہوا کرتی تھیں۔ جن میں ہاتھ ملاتے والے ایک دوسرے سے پوچھتے نظر آتے کہ "کیوں بھئی! اب تک کتنے من گوشت یا سوئیاں کھائیں؟"

ان کارڈوں پر اس قسم کے اشعار چسپاں نظر آتے تھے:۔

عید کا دن ہے گلے آج تو مل جا ظالم
رسم دنیا بھی ہے موقع بھی ہے دستور بھی ہے

انتیسویں کو آج تری دید ہو گئی
اب چاند ہو کہ چاند نہ ہو عید ہو گئی

وعدہ کیا تھا یار نے آؤں گا دن ڈھلے
سورج خدا کے واسطے ہو جا تلے تلے

غافل تجھے گھڑیاں یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

جا لگے ہے جاگ، لے افلاک کے سائے تلے
حشر تک سوتا رہے گا خاک کے سائے تلے

ان کارڈوں کو فوراً ٹکٹ لگا کر پوسٹ کر دیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں پردہ پوشی کے لیے ہر کارڈ کے سائز کا برقع پوشش کرنا آج کل کی طرح ضروری نہ تھا مگر اب ان کارڈوں کو خوشبو میں بسا کر اس شوق و احتیاط سے رکھا جاتا ہے گویا لفافے میں کارڈ نہیں بلکہ صاحب کارڈ اپنے آپ کو بند کر رہے ہیں۔

اگر کارڈ پر شعر نہ ہو تو اس کمی کو لفافے پر شعر لکھ کر دور کیا جاتا ہے۔ اس موقع کا بھی ایک شعر سنیئے ؎

خط کبوتر کس طرح لے جائے بامِ یار پر
پر کترنے کو لگی ہیں قینچیاں دیوار پر

پھر اس لفافہ کو اس شوق سے پوسٹ کیا جاتا کہ بھیجنے والے کی روح لیٹر بکس ہی میں رہ جاتی۔

وقت کے ساتھ یہ کارڈ بھی گئے اور ان کی جگہ نئے کارڈ اور ٹیڈی کارڈ آئے جن کے خریدنے والوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ دوکاندار نے کارڈ دینے کے بہانے ان کی کھال اتار لی ہے۔

ان عید کارڈوں کے لئے سب سے زیادہ "عید نامے" اور "عیدیاں" حاجی لق لق نے کہی ہیں جن کی تعداد بلا مبالغہ ہزاروں تک پہونچتی ہے

حاجی لق لق کے عید سے متعلق اشعار ان کے شعری مجموعوں "لقلقی عیدیاں"، "عید نامے" "عید مبارک" "لقلقہ" "منقار لق لق" "کلام لق لق" "پرواز لق لق" "آواز لق لق" "ماڈرن غزل" اور "ادب کثیف" وغیرہ کے علاوہ بے شمار ادبی رسالوں کی فائلوں، عید کے گلدستوں اور عید کارڈوں میں آج بھی محفوظ ہیں۔

حاجی لق لق کی کچھ دلچسپ عیدیوں کے عنوان ملاحظہ فرمایئے۔

"بکرا عید" بقر عیدی غزل" "نامہ عید قرباں" "عید قرباں" "دو چاند" "جنونِ عید"

نیک مطلوب، دیدارِ عید، سلام عید، عید مبارک، آؤ آؤ آؤ، گمشدہ کی تلاش، ہلال عید، عید کا چاند، نامۂ عید، صبح عید، نغمۂ عید، عید کارڈ، مبارکباد عید، عید ہے۔ سوئیاں گرم، تمہاری سواری، دوگونہ محبت، ہوائی عید، فوجی عید، عید بنک، چار سو بیس، عید باغ، عید گاہ، ٹر، موروثی عید، جنگی عید، ملائی عید، عید ڈھنڈورا، عید ٹیلی فون، عید ہڑتال، عید بم، ٹیڈی عید، فلمی عید، سیاسی عید، انگوٹھا چھاپ عید، رقیبوں کی عید، شکوہ قسمت، فریادِ عید، حسرت دیدار، تمہاری سواری۔"

حاجی لق لق کا مخصوص رنگ ظرافت ان کے "عید ناموں" میں بھی خاصا نمایاں ہے اس کے کچھ نمونے دیکھئے:-

بقرعیدی غزل

مجھے اب ذبح کرنے میں ترے کیا عذر باقی ہے
چھری تو تھام لے اے یار میں تکبیر پڑھتا ہوں

بروز عید الضحیٰ کاش اے جاں تو بھی آ جاتا
ترے رخ کے تصور کے اکیلا گوشت کھاتا ہوں

نہ ملے گا نہ ملے گا بھلا کب تک نہ ملے گا؟
تمہاری جستجو میں بن سوئیاں کھا کے نکلا ہوں

عید مبارک

"السلام علیکم۔ عید مبارک
آج دنیا میں عید ہے
ہمارے شہر میں عید ہے
ہمارے گھر میں عید ہے
لیکن ہمارے دل میں محرم ہے

اور تمہاری یاد ستیہ گرہ کئے بیٹھی ہے

نہ نکلتی ہے

نہ چین لینے دیتی ہے

خود آؤ، یا کوئی آرڈیننس جاری کرو۔

آخر آپ میں اور عید میں کیا رقابت ہے؟

کیا اب کے ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

کہ آپ بھی آئیں اور عید بھی

تاکہ میں یہ کہہ سکوں۔ کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔"

صبح عید

"عزیز ترانہ جان

السلام علیکم

آج صبح عید ہے۔

گلشن میں عید مارچ کرتی معلوم ہوتی ہے

غنچوں کے چٹکنے سے گمان ہوتا ہے کہ ———

وہ عید کارڈ ٹائپ کر رہے ہیں

بلبلوں کے ترانے ظاہر کرتے ہیں کہ ———

وہ عید کا "ماہیا" گا رہی ہیں۔

ہم بیکار کیوں بیٹھیں؟

آؤ ایک دوسرے کے گلے ملیں

رو برو نہیں تو تصور ہی سہی

انتظار زدہ

".............."

دو چاند

مہربان بندہ !

السلام علیکم۔ عید مبارک

عید کا چاند تو دیکھ لیا۔ لیکن آپ عید کا چاند ہو گئے۔

عید کا چاند آیا۔ لیکن آپ نہ آئے۔

خدا جانے آپ دونوں میں کیا رقابت ہے ؟

وہ رات کا چاند آپ دن کے چاند

وہ شام کو آیا، آپ صبح کو آیئے۔

کشتۂ انتظار

"..............................

ہوائی عید

"مہربان من !

السلام علیکم

خواہش یہ تھی کہ ہوائی جہاز ملتا تو اس میں بیٹھ کر آپ کے گھر "عید مبارک" کے بم گراتا اور پھر پیراشوٹ کے ذریعہ آپ کے صحن میں نازل ہوتا لیکن دونوں چیزیں میسر نہیں اس لیئے دور ہی دور سے "عید مبارک" قبول فرمایئے۔

ہواباز محبت

"..................

عید باغ

مہربان من

عید مبارک

نسیم سحر اخبار پڑھ رہی ہے۔

بلبلیں چائے پی رہی ہیں۔

سبزہ پان لگا رہا ہے

شبنم دوپٹہ چن رہی ہے۔

قمری سوٹ پہن رہی ہے

لیکن تمہارے انتظار میں میری سوئیاں ٹھنڈی ہو رہی ہیں۔ اگر کچھ قسمت میں ہے تو آجاؤ

نیاز مند

..........."

جنگی عید

"محبِ من

السلام علیکم۔ عید مبارک

ہلال عید نے اعلان جنگ کر دیا۔

کل میں ہوؤں گا اور عالم گیر جنگ

یعنی تمہیں نہ پا کر

تمام دنیا سے بیزار ہو جاؤں گا

گھر والوں سے لڑوں گا

باہر والوں سے لڑوں گا

زمین سے لڑوں گا

آسمان سے لڑوں گا

تانگے والوں سے لڑوں گا

غرض پورا "جنگ نامہ" بن جاؤں گا۔

تم آؤ۔ تو عارضی صلح ہو سکتی ہے۔

جنگ زدہ

"..........."

عید ہے؟

"عزیز من!

سلام نیاز!

ہمارے ہاں تو آج عید ہے۔

آپ کے شہر میں کیا ہے؟

یہ اس لئے پوچھتا ہوں کہ ہر جگہ کے حالات یکساں نہیں ہوتے۔

کشمیر میں برف پڑتی ہے، تو

پنجاب میں لُو چلتی ہے۔

ہندوستان میں دن ہوتا ہے

تو امریکہ میں رات ہوتی ہے۔

بہر حال اگر آپ کے ہاں بھی آج عید ہو ۔۔۔ تو

گستاخی معاف۔

آپ کا کیا؟

"..........."

حسرتِ دیدار

"مشفق و مہربان

السلام علیکم مع عید مبارک۔

بھئی ہم بھی کس زمانے میں پیدا ہوئے۔

ابھی تک بجلی کے ذریعہ ایک لمحے میں ایک شہر سے دوسرے شہر پہونچنے کا آلہ ایجاد

ہنیں ہوا

کم از کم آج تک ٹیلی ویژن ہی آگیا ہوتا۔

تو ہم گھر بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھ سکتے۔

اور جب عید مبارک کہتے تو

دونوں کو غش آجاتا۔

گرسنۂ عید

"...............

گمشدہ کی تلاش

"

عزیز من!

عید کے دن میں تمھیں کہاں تلاش کروں؟

تمھیں کس طرح پاؤں؟

پوسٹر چھپواؤں؟

"گمشدہ کی تلاش" کے لئے اخبار میں اشتہار دوں؟

منادی کرادوں؟

وارنٹ نکلواؤں؟

تم ہی بتاؤ۔ کہ کیا کروں؟

بہتر تو یہ ہے کہ نماز عید سے پہلے اصالتاً حاضر ہو ورنہ یکطرفہ ڈگری

کی جائے گی۔

محو جستجو

....

تصویرِ یار

"
بندہ پرور !

کل میں ہو ٔنگا یا آپ کی یاد بھی سویاں ۔

ادھر پیٹ میں سویاں ابلیں گی ۔

اور اِدھر دل میں آپ کا تصور قلا بازیاں کھائے گا ۔

میرے لئے دونوں بہت عزیز ہیں ۔

اس لئے میں دونوں کا ستم سہوں گا ۔

مجھے آپ کا تصور مبارک

اور آپ کو میری " عید مبارک " مبارک !

آپ کا بندہ .... "

سویاں گرم

"
دوست مشفق !

سلام کے بعد واضح ہو کہ اس جگہ ہر طرح عید ہے

اور آپ کی عید نیک مطلوب ۔

صورت احوال یہ ہے ۔ کہ

اگرچہ بارش کم ہوئی ہے

لیکن سوئیاں سستی ہیں ۔

حکم ہو تو عید کے دن جتنی کھانے سے بچ رہیں پارسل کر دی جائیں ۔

خورد و کلاں اور حال پرساں کو عید مبارک

زیادہ حد ادب

نیاز مند

.... "

عید بم

"مکرم بندہ - تسلیم۔

عید کا تیوہار مجھ پر بم بن کر گرا

آپ کی یاد میں دل زخمی ہوگیا۔

اور جگر مجروح

سینہ بریاں ہے اور چشم گریاں۔

اگر آپ پہونچ جاتے تو ــــــ ۔ ۔ ۔

ایمبولنس کار کی ضرورت نہ رہتی

اب اسپتال جانا پڑے گا۔

بہرحال آپ کو یہ عید مبارک ہو۔

فقط - والسلام

زخمی عید ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

عید ہڑتال

"مشفق و مہربان!

السلام علیکم ۔ عید مبارک

دور افتادہ کی عید کیا؟

سوّیاں محض اس لئے زہر مار کرونگا کہ میٹھی چیز ہے۔

ورنہ آپ کی جدائی میں بھوک ہڑتال کرتا ۔

کاش اے یار تو ریڈیو میں ملازم ہوتا

تو نہ آتا تری آواز تو آئی ہوتی

انتظار زدہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ان عیدیوں میں جہاں حاجی صاحب کی شگفتگی اور زندہ دلی کی جھلکیاں ملتی ہیں وہاں "ادب لطیف" اور شاعری میں نظم کے نام پر محض تُک بندی کی یہ ایک قسم کی تحریف بھی ہے۔ عید کے دن محبوب سے ملاقات کے اصرار اور امکان کے تصور کا بھی انھوں نے بڑے دلچسپ انداز میں مذاق اڑایا ہے اس کے کچھ نمونے اور دیکھئے

گھر مرے آؤ عید کا دن ہے
دیکھو صاحب یہ دید کا دن ہے
کچھ کہو اپنی کچھ سنو میری
آج گفت و شنید کا دن ہے

آ جا کہ مرے گھر میں بہار آ جائے
ہو عید کا دن اب تو قرار آ جائے
ایسا نہ ہو بیٹھک میں سجاتا ہی رہوں
اور تیرے بجائے نزاتار آ جائے

روز ابر سیاہ میں نہ ملے
شب کی تنویر ماہ میں نہ ملے
عید کے دن تو حیف ہے جینا
تم اگر عید گاہ میں نہ ملے

مجھ منتظر دید کو پُر غم نہ بنا
اے دوست مرے دید کو پر نم نہ بنا

ٹیکسی میں چلا آ کر اے میرے ذتے

ہے عید کا دن اس کو محرم نہ بنا

حاجی لق لق کی سدا بہار عیدیوں کے محض یہ چند نمونے ہیں۔ ایک موضوع کو بار بار دہرانے کے باوجود، اس میں نئے نئے پہلو پیدا کر لینے کی اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ حاجی صاحب کو اظہارِ خیال پر کس قدر قدرت تھی۔ اس لحاظ سے حاجی لق لق کی عیدیاں اردو ادبِ ظرافت کے لیے ہمیشہ ایک تحفہ کی حیثیت سے یادگار رہیں گی۔

فرمان ظرافت کا شاعر

حامد رضا نقوی ظریف جبلپوری ۲۶ نومبر ۱۹۱۳ء کو کٹنی ضلع جبلپور میں پیدا ہوئے۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد جبلپور ہی میں ملٹری انجینیرنگ سروس سے وابستہ ہوگئے۔ ابتدا سے طبیعت ظرافت کی طرف مائل تھی۔ ان کا بیشتر کلام اودھ پنچ۔ سرپنچ اور نمکدان کے علاوہ ان کے ترکش "فرمان ظرافت" میں ڈیڑھ ہزار منتخب اشعار کی صورت میں محفوظ ہے۔

ظریف بادہ کہنہ تھے اس لیے ان کے یہاں تیزی اور شوخی کی فراوانی ہے۔ ان کا آرٹ بہکنے اور بہکانے والا تھا اس میں پختگی اور استادانہ پن کے علاوہ زبان و بیان کا حسن، محاوروں کے طلسم اور الفاظ کے جادو بہت عام ہیں۔

احمق پھپھوندوی، شوکت تھانوی، حاجی لق لق، اسعد ملتانی، شاہ عارفی، اور شوق بہرائچی کے بعد یکم مارچ ۱۹۶۴ء کی صبح کو اچانک حرکت قلب بند ہونے سے ظریف جبلپوری بھی ہمیشہ کیلیے ہم سے جدا ہوگئے۔ انھوں نے ۵۱ برس کی عمر پائی۔ تاریخ انتقال رئیس امروہوی نے "سبرنیہ طنز و مزاح و ظرافت" اور روشن بدایونی نے (دل اب یاد ظریف میں روتا ہے۔) نکالی۔

ظریف جبل پوری کا شمار طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کے اساتذہ میں ہے۔ وہ اس وجہ سے بھی اہم ہیں کہ ان کے کلام میں قدیم اور جدید کی آویزش بڑے خوشگوار انداز میں ملتی ہے۔ غزل کا حق ادا کرنے کے ساتھ ان کے کلام میں عصری میلانات اور مسائل کی بازگشت بہت عام ہے۔ وہ بدلتے ہوئے سماج کے تقاضوں اور حیات نو کی شاہراہوں سے ہم آہنگ ہو کر سوچتے چلتے ہیں۔

ان کی غزل میں سلاست اور روانی کے ساتھ محاورے کا لطف، تشبیہ کی معنی

آفرینی استعارے کے طلسم اور زبان کے چٹخارے بہت عام ہیں۔ ہر چند کہ وہ خود ہی کہتے ہیں کہ:-

لکھنوی، دہلوی میں نہیں ہوں ظریفؔ

بھائی میرا وطن تو جبل پور ہے

مگر اس انکساری کے باوجود ان کے یہاں دہلی اور کراچی کی ٹکسالی زبان کا ذائقہ لطف اور چٹخارہ مل جائے گا۔

بحروں کے تجربات، رعائتوں کے استعمال الفاظ کا سلیقہ اور موضوعات کے انتخاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ ظریف قادر الکلام ماہر طنز تھے۔

ظریف کی نظموں میں ہندوستان، مادر وطن، اور تکنیک شاعر بہت مشہور ہیں۔

انھوں نے مہنگائی، سیاست ہٹبڑی ازم، جنگ علم بیجا آزادی، بے روزگاری، روایتی، عشق، چور بازاری، کنٹرول، الکشن، واعظ اور محبوب کو خاص طور پر اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

ظریف کو تضمین کا بڑا سلیقہ ہے۔ فرمان ظرافت میں اس کے دلچسپ نمونے مل جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ گرہ لگانے کے ماہر بھی تھے۔ چند نمونے دیکھئے:

برائے شکار ایک دن جو گیا

ہرن دور بیٹھا دکھائی دیا

جو نزدیک پہونچا تو تھا

کریما بہ بخشائے برحال ما

کہ ہستم اسیر کمند ہوا

★

کبھی دل میں تیری پازیب طلائی کا خیال

کبھی آتا ہے تری سرخ رضائی کا خیال

دل سے مٹتا نہیں تری انگشت حنائی کا خیال

ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

★

میاں چانڈو پیتے ہیں، بیوی چرس

ہیں بچے بہ فضلِ خدا آٹھ دس

ہری گود ہو جاتی ہے ہر برس

خداوند کیسے ہیں یہ بوالہوس

تو ئی عاصیاں را خطا بخش و بس

★

سانڈ سے میں نے یوں کہا، بیٹھے ابھی یہاں نہیں

اٹھئے جناب آپ کے باپ کا یہ مکاں نہیں

کہنے لگا نہیں نہیں، اٹھتے نہیں ہیں، ہاں نہیں

"دیر نہیں حرم نہیں، در نہیں آستاں نہیں

بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں"

ظریف معاملہ بندی کے ساتھ ساتھ محاورہ بندی کے بھی ماہر نہیں زبان پر قدرت کے نمونے دیکھئے۔

سب سے پہلے عشق میں انگلی ہی پکڑی جائے گی

رفتہ رفتہ پھر کہیں پہونچ کا نمبر آئے ہے

پاجامے کرتے ایکطرف نو شکے صفائی اکطرف

دفتر کے بابو لوگوں کا گاڑھی کمائی اکطرف

تدبیر اور تقدیر میں ہاتھا پائی اک طرف

جورو سے کل کل اکطرف جورو کا بھائی اکطرف

ظریف کے یہاں اسادانہ اظہار بیان عجیب عجیب انداز سے ملتاہے اس کا ایک دلچسپ نمونہ ذیل میں درج ہے جس میں انھوں نے دو طرحوں میں ایک غزل کہی ہے ؎

دو طرحوں میں ایک غزل اور چار دن کی محفل ہیں

وہ ظریف زندہ دل

کوئی اس کی داد نہ دے، لیکن یہ انوکھا کام کیا

ایسا رنگ جمائے کون

ذکر ہمارا جب بھی آیا ہاتھ بڑھایا دامن کی طرف

ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا

دست جنوں نے میرے جنوں کا کتنا بڑا انجام کیا

اب کپڑے بنوائے کون؟

جانے والے تیری گلی میں جانے سے ڈر جاتے ہیں

داڑھی والے دربان سے

تیرے ظالم دربان دو چار کا کام تمام کیا

تیری گلی میں جائے کون

بے حجابی، عریانیت اور ٹیڈی ازم کے خلاف ہمارے ظریف شعرا بہت کچھ کہتے رہتے ہیں۔ ظریف کی نظم "بوجھو تو جانیں" اس سرمایہ میں ایک دلچسپ اضافہ اور خوشگوار طنز ہے ؎

جلوے لٹاتی بنتی بناتی

شانوں پہ اپنے پٹے اڑاتی
کون آرہی ہے؟ ذہنوں پہ چھاتی
معصوم دل پر بجلی گراتی
اک اک قدم پر فتنے اٹھاتی
سب کچھ چھپا کر سب کچھ دکھاتی
کپڑے پہن کر
جامے سے باہر

آگے بھی کالر پیچھے بھی کالر
یہ تنگ مہری یہ چسپت جمپر
دم گھٹ رہا ہے اندر ہی اندر
رکنا بھی مشکل چلنا بھی دوبھر
لیکن چلے گی
چل کر رہے گی

دیدار دیکھیں شلوار دیکھیں
اک اک ٹیک کو سو بار دیکھیں
جلووں کی اسکے بھرمار دیکھیں
اب تیل دیکھیں یا دھار دیکھیں

آنکھوں پہ کاگل پیروں میں چٹی

اک آڑ کو ہے　　فیشن کی ٹٹو
چوتھا دو پٹہ　　ہے اک پٹی
کیسی بگاڑی　　کپڑے کی مٹی
گز بھر کا جمپر
گھٹنوں سے اوپر

اپنی اس مزاحیہ شاعری کے سلسلے میں ظریفؔ جبلپوری ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

شاد عارفی کی بے باکی

شاد عارفی کی موت ایک عہد کی موت ہے۔ اس عہد کی موت جس میں یہ پیر طناز وقتی مصالح سے بے نیاز ہو کر بڑی بے باکی کے ساتھ اپنا مافی الضمیر ادا کرتا تھا۔ بلکہ فکر پر طنز کے تازیانے لگانے کیلئے اکثر جارحانہ تنقید کی حدود سے بھی گزر جاتا تھا۔ اس شاعر زہر خند کی فکر کا عرصہ ہماری معاشرتی زندگی کی نصف صدی کے طول و عرض پر چھایا ہوا ہے۔

شاد عارفی کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے درباری ماحول میں آنکھ ضرور کھولی مگر نظیر اکبر آبادی کی طرح اس گھٹے ماحول میں کبھی سانس نہ لی۔ بلکہ اپنی دنیا الگ بنائی اور زندگی بھر خون جگر سے اس کی لالہ کاری میں مصروف رہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق مزاج کے اعتبار سے معاصرین میں ان کے حریف صرف یگانہ چنگیزی سمجھے جاتے۔ سماجی اقدار، تہذیب اور معاشرت کے تاریک گوشوں تک پہنچے اور سماجی عدم توازن کو ہدف علامت بنانے میں شاد عارفی نے اپنی شخصیت علاحدہ بنائی۔

شاد عارفی کا نام احمد علی خاں اور تخلص لڈن تھا ۱۹۰۰ء میں لوہارو میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد تھانیدار تھے۔ شاد عارفی کا ددیہال افغانستان اور ننیہال رام پور تھا۔ ابتدائی تعلیم لوہارو میں ہوئی۔ ۱۵ برس کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھنے کے بعد رام پور آگئے۔ اور ٹیوشن کر کے انٹرنس تک کسی نہ کسی طرح پڑھائی جاری رکھی۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ شروع میں شفیق رامپوری اور جلیل مانکپوری سے اصلاح لی۔ ان کی پہلی نظم "اضطرار" ہمایوں لاہور میں چھپی تھی۔ نظموں کا پہلا مجموعہ "سماج" ۱۹۴۶ء میں علی گڈھ سے چھپا۔ ۱۹۵۶ء میں انجمن ترقی اردو نے شعرا کے انتخابی سلسلہ میں ان کا کلام چھپایا۔ اس کے

بعد جشن شاد عارفی کے موقع پر سولت لائبریری رام پور نے اکتوبر ۱۹۶۶ء میں ان کا انتخاب کتابی صورت میں پیش کیا۔ ایک طویل علالت کے بعد ۸ رجنوری ۱۹۶۴ء کو اپنے وطن رام پور میں انتقال کر گئے۔

شاد عارفی نے مختلف سرکاری غیر سرکاری ملازمتیں کیں۔ ۴۰ سال کی عمر میں شادی بھی کی تھی۔ مگر ۱½ سال بعد اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔

شاد عارفی کی شاعری اور شخصیت کو سمجھنے کے لئے ان کے اس مخصوص مزاج کو سمجھنا ضروری ہے۔ جس میں افغانستان کا خمیر، رام پور کی ہوا اور پنجاب کا پانی ملتا ہے۔ اس کی وجہ سے انکی زندگی کے علاوہ کلام میں بھی ایک جھلاہٹ آگئی تھی۔ زندگی کی ناکامیوں، اعزاو احباب کی بے وفائی، زمانہ کی سرد مہری اور ناسازگار حالات نے اس پر جلا ر کر دی۔

شاد عارفی پرانے نیشنلسٹ اور ایک زمانہ تک کانگریسی بھی تھے۔ اگرچہ بعد میں انکے سیاسی خیالات تبدیل ہو گئے تھے۔

ان کی صحت کی مسلسل خرابی، طبیعت کا کھرا پن، خودداری، مسلسل افلاس اور آزمائش نے جہاں ان کو مخصوص مزاج عطا کیا۔ وہاں ان کی شاعری میں اس سے جلا بھی پیدا کی تخلیق کی لگن اور فن کار کے اندر کی آگ نے ان کو ہر چیز سے بے نیاز کر کے ان میں جوانوں سے زیادہ زندگی کا حوصلہ اور خوش آئند زندگی کی آرزو اور فانی کی قنوطیت کی جگہ ایک عجیب انداز کی رجائیت پیدا کر دی اپنے آپ کو غرق شراب ناب کرنے یا حکایات گل و بلبل کا سوز خواں بننے کے بجائے انھوں نے نظام اخلاق اور سماج کی کہنہ روایات فرسودہ خیالات اور معاشرتی خامیوں کو بے نقاب کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح اپنی ذات کے غم کو شہر آشوب زمانہ بنا کر زندگی کی تلخیوں کو طنز کے تیر و نشتر میں سمو کر ان نشتروں سے سماج کی خامیوں پر جراحی کا عمل ایک ماہر سرجن کی طرح کیا۔ انھوں نے سیاسی اور سماجی خامیوں پر بڑے جارحانہ انداز میں طنز کئے ہیں۔ مگر اس طنز میں انسان دوستی اور ہمدردی کے عناصر بہت نمایاں

ہیں۔ ان کی نظر میں انسانیت کے اعلیٰ آدرش ہیں۔ جن پر پورا نہ اترنے والی کیفیات و حالات ان کے طنز کی زد میں آتے ہیں۔ ان کے یہاں طنز خالص شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے جس میں جھلاہٹ اور کڑوے پن کے ساتھ ایک تیکھاپن ضرور ہے۔ یہی وہ خوبی ہے جو ان کے دوسرے معاصرین سے ان کو ممتاز کرتی ہے۔ ان کو دکھتی رگیں پکڑنے اور سنگی لگانے کا فن آتا ہے۔ یہاں ان کا قلم پٹھان کا نیزہ بن کر جگر کے پار ہوتا ہے۔ ان کے یہاں خیر و شر کی کشمکش میں ہمیشہ بدی کا منہ کالا ہوتا ہے۔ اور اصلاح کا پہلو اجاگر ہو جاتا ہے۔ اسی رنگ کی وجہ سے طنزیہ شاعری پر ان کا ٹھپہ سب سے الگ اور نمایاں ہے۔ اپنی شاعری کے بارے میں خود لکھے ہیں۔

"میرا اپنا ایک مخصوص زاویہ فکر ہے جو طنز و سیاست کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ ندرت میرے نزدیک شعر کی جان ہے۔"

اس طنز کا نشانہ انھوں نے سماج سے لیکر ارباب حل و عقد تک سب کو بنایا۔ اس کلام میں زہر کی تلخی ضرور ہے۔ مگر تصنع اور بناوٹ سے اسے کوئی لگاؤ نہیں قدم قدم پر وہ کھلے کھلے انسانوں، نمائشی لیڈروں، وقتی مصالح، مفاد پرستی اور معاشرہ کی جملہ خامیوں پر فکر کے تازیانے لگاتے نظر آتے ہیں۔ یہاں شاعری ان کے لیے لذت کے بجائے عبادت معلوم ہوتی ہے۔ جس میں وہ گدگداتے نہیں بلکہ طمانچے لگاتے ہیں۔ تنقید کا یہ جارحانہ انداز خالص فطری ہے۔ اس شاعری میں سماجی حقیقت نگاری اور حب الوطنی کے بڑے اچھے مرقعے ملتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ہمارے معاشرے کے منفی پہلوؤں کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ شاد عارفی نے ایک ہزار مثالی کردار نظم کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس کے بعض کردار بلا شبہ ہمارے طنزیہ شعری ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہیں دیکھیے یہ بھی شعر شاد عارفی کا ہے ؎

چاپ سن کر جو ہٹا دی تھی اٹھا لا ساقی
شیخ صاحب ہیں میں سمجھا تھا مسلماں ہے کوئی

شاد عارفی کے آرٹ کا کمال "اندھیر نگری، نوکرانی، رنگیلے راجا کی موت، جبر و قدر، بیٹے کی شادی، مشورہ، ساس، مہترانی، ان اونچے اونچے محلوں میں، پروڈیوسر، شوفر، فلمی محبت اور آپ سے ملئے" اپنے فن کی معراج پر ہے۔ جس میں جاگیر دارانہ نظام کی لعنتوں، پرانے گورکھ دھندوں، ظالم و مظلوم کی کشمکش، فرسودہ رسم و رواج، جہیز، فضول خرچی، چھوت چھات، عدم مساوات، فلمی دنیا کے نشیب و فراز، خوشامد اور چھوٹے چھوٹے سماجی مسائل کو بڑی حسن و خوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ "آپ کی تعریف" آپ بھی سُنیئے

لگ چکا ہے ان کی داڑھی کو کلف
یہ غلامان سیاست اقتدار
قوم کے کاندھوں پہ رہتے ہیں سوار
دیکھنے میں "ہستی معقول" بھی
"پردہ دار عیب" زریں جھول بھی
چٹکیاں کھاتے ہیں کردار عمل
عقل کو لاحق ہو "کرسی" کا خلل
دیکھنا تالی پٹے گی ہر طرف
لگ چکا ہے ان کی داڑھی کو کلف

شاد عارفی کے طنزیہ کلام میں ان کی نظموں کے بعد سب سے زیادہ اہمیت ان کے قطعات کی ہے۔ ان کے کلام کے کچھ نمونے آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

بلند و پست بھی نسبت ہے غیر قانونی
غرور و عجز میں رشتہ سماج بچتی ہے
کسی امیر کی لڑکی کسی غریب کے ساتھ
نکاح عیب سمجھتی ہے بھاگ سکتی ہے

ہے یہی آبادکاریٔ وطن تو ایک دن

دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

راموسو پر دو لیتا ہے گیہوں بوکر جو کاٹے گا

منھ سے خون تو لگ جانے دو جو بوئے گا سو کاٹے گا

منحصر تھا وقف کی رقموں پر عشق خانقاہ

ساقیان سیم ساق و مطرب زہرہ نگاہ

لیکن اس عہد زوال خردی میں بالعمام

مقبروں کے مہتمم ہیں حضرت عالم پناہ

لیلائے غزل

جوان شاعر تو شاد اس لغویت سے دامن چھڑا چکے ہیں

مگر ضعیفوں میں اب بھی چرچا ہے چاک دامانی رفو کا

ہمارے شاعر غلط بیانی سے آج بھی کام لے رہے ہیں

وہ کون محبوب ہے کہ جس کے دہن نہیں ہے کمر نہیں ہے

سوال اس میں نہیں حسینوں کو بت نہ کہیے ضرور کہیے

مگر بعید از قیاس ہو جائے گا کہ پتھر بھی بولتا ہے

شراب و مشاہد کے تذکرے ان سے چھین لیجیے تو کیا کریں گے

شراب و شاہد کے تذکروں تک ہی جن کی جادو بیانیاں ہیں

ان کی خدمت میں مرا ہر طنز شاد

بے محابا، فی البدیہہ و برمحل!

ستمگر کو میں چارہ گر کہہ رہا ہوں

غلط کہہ رہا ہوں مگر کہہ رہا ہوں

مجھے آج کانٹوں کا منھ چومنے دو!
بہاروں کا رخ دیکھ کر کہہ رہا ہوں

ادر تو کیا یہ نمکخوار سیاست دیںگے
ذہنِ سرکار کو تعریف کی رشوت دیںگے
آپ کے دوست اگر آپ اجازت دیںگے
پاس بیٹھے ہوئے ترغیب حماقت دیںگے
کھری باتیں باندازِ سخن کہدوں تو کیا ہوگا
عدوئے جان و تن کو جانِ من کہدوں تو کیا ہوگا
اندھیرے کو اندھیرا ہی کہیں گے دیکھنے والے
سوادِ شام کو صبح اگر کہدوں تو کیا ہوگا

چاہتا ہوں فائدہ سرکار کا
جائزہ لیجئے میری گفتار کا
میں پڑوسی ہوں بڑے دیندار کا
کیا بگڑتا ہے مگر میخوار کا
ہم خدا کے ہیں وطن سرکار کا
جائزہ لیجیے میری گفتار کا
خشک لب کھیتوں کو پانی چاہیئے
کیا کریں گے ابر گوہر بار کا
جب چلی اپنوں کی گردن پہ چلی
چوم لوں منہ آپ کی تلوار کا

بعض احمق تک رہے ہیں آجتک
آسرا گرتی ہوئی دیوار کا!
جب سے پی ہے پی رہا ہے آج تک
شیخ بھی ہے آدمی کردار کا

جناب شیخ سیاست کے پھیر میں پڑکر
تبانِ دیر کو پروردگار کہتے ہیں!

فسانہ ستم بڑے ہنر سے کہہ رہا ہوں میں
چناں چنیں کے ساتھ، اگر مگر سے کہہ رہا ہوں میں
وقت کیا شے ہے پتہ آپ کو چل جائے گا
ہاتھ پھولوں پہ بھی رکھے گا تو جل جائے گا
کہیں فطرت کے تقاضے بھی بدل سکتے ہیں!
گھاس پر شیر جو پالوگے تو پل جائے گا!
ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھ
گھری ہے ایک طوائف تماش بینوں میں

کیا کسی نوازش کی پول کھول دی میں نے
آنکھ جھینپتی کیوں ہے، کیوں زبان بہکتی ہے

یاد ہیں جس شخص کو صحرا نوردی کے مزے
دوسروں کے پاؤں میں کانٹے چبھونے سے رہا

راجہ مہدی علی خاں کی ظرافت

راجا مہدی علی خاں اس خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ جس نے عرصے تک متحدہ ہندستان کی راہ نمائی کی۔ وہ مولانا ظفر علی خاں کے بھانجے تھے۔ پہلے پھول، زمیندار، احسان اور انقلاب سے منسلک رہے اس کے بعد فلمی دنیا میں چلے گئے۔ مگر ان کی شہرت کا سبب وہ مزاحیہ شاعری ہے جو گذشتہ چوتھائی صدی کے ادبی اخبارات اور رسائل کی جلدوں میں وہ ہمارے لئے محفوظ کر گئے اور جس کا عطر ("انداز بیاں اور") کتابی شکل پیش کیا جا چکا ہے۔

راجا مہدی علی خاں کا تعلق اس نسل سے ہے جس نے ۱۹۳۵ء میں اردو ادب میں سیاسی بیداری اور ذہنی انقلاب کا پرچم بلند کیا تھا۔ حریت فکر کی اس راہ پر وہ ہنستے ہوئے چلے مگر اس کے باوجود زمانے سے وہ اتنے ہی باخبر تھے جتنے کہ منٹو ڈاکٹر عبدالعلیم جیسے سنجیدہ دانشور۔

اس اعتبار سے اکبرالہ آبادی کے سلسلے کی یہ ایک اہم کڑی ہیں اور اسی وجہ سے ان کے قہقہے کی تہہ میں سنجیدہ فکر اور منطقی پیرایہ اظہار ملتا ہے۔

اپنے معاصرین کے مقابلہ میں ان کی مزاحیہ شاعری کا طرز، احساس، انداز نظر اور مسائل کے بارے میں رو یہ سب سے منفرد ہے

راجا مہدی علی خاں کے طنز کا مرکز بنی نوع انسان ہے وہ سماج کی ناہمواری پر طنز کر کے مزاح کے لطیف پہلو ابھارتے ہیں۔

ان کے مذاق کا نشانہ فرسودہ روایات اور بے جا رسوم بنتی ہیں۔ ان کے اس طنز

میں خوشگوار شریت ملتی ہے۔

ان کے ممتاز معاصرین مثلاً جوشش ملیح آبادی، سید محمد جعفری، دلاور فگار، دواہی فرقت کاکوروی، ابن انشار ، اسعد ملتانی، رئیس امروہوی، سید ضمیر جعفری، کوہ کن، اور اظہار ملیح آبادی وغیرہ میں شاید ہی کسی کے یہاں آپ کو یہ رنگ نظر آئے۔

راجا مہدی علی خاں کا منفرد رنگ، اسلوب اور جدت ان کو اپنے معاصرین میں ایک ممتاز حیثیت عطا کرتی ہے۔

خالص ظرافت اور معصوم شوخی کا یہ اسلوب اردو کی مزاحیہ شاعری میں عام نہیں اس رنگ میں ان کی ابتدا "پھول" سے ہوئی۔ اس میں ان کی طفلی ظرافت خوب پھلی پھولی۔ اور اس کے اثر سے ہمیشہ ان کے کلام میں شادابی، معصومیت اور بے ساختگی نمایاں رہی۔ ان کے طنز کی خشونت ابھر کر نہیں آپاتی۔ اسی کیفیت میں وہ ڈوب کر بے عمل انسانوں کی "شیخ چلی بلاننگ" پر قہقہہ لگاتے نظر آتے ہیں۔ ہنسی ہنسی میں وہ معاملات کی تہہ تک پہونچ جاتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر وزیر آغا

"ان کی اس رو کی اہمیت زیادہ تر تعلیمی ہے اور یہ عہد طفلی میں مزاح کی صلاحیتوں کو بیدار کر کے اس کے ارتقار کی طرف بچوں کو گامزن ہونے کی تحریک دیتی ہے۔"

ان نظموں کی نفسیاتی اور تعلیمی اہمیت کے پیش نظر طنز و مزاح کے سرمایہ کا جائزہ لیتے وقت اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

ان نظموں میں بچوں کے ذوقِ ظرافت کو تحریک دے کر بے معنی الفاظ، لمبے چوڑے خیالات اور عجیب و غریب واقعات کو اس طرح ابھارا گیا ہے کہ بچے کو حالات اور واقعات کی ناہمواری کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ بے اختیار ہنس دیتا ہے۔ اس کی بہترین مثال "چور کی دعا' چار بچے ' بچوں کی توبہ، خرگوشوں کی غزل اور ننھی جوگن خدا کی

"تلاش میں" جیسی شگفتہ نظمیں ہیں۔

بچوں میں ظرافت کا خدا داد مادہ ہوتا ہے جس چیز پر ہم آسانی سے مسکرا بھی نہ سکیں بچے اس پر بے اختیار قہقہے لگاتے ہیں۔ جن چیزوں کے ہم عادی ہیں وہ ان کے لیے بالکل نئی ہوتی ہیں۔ بچوں اور بڑوں میں وہی فرق ہوتا ہے جو ہم میں اور سیاح میں — چیزوں کا یہ نیا اور انوکھا پن ان کی ظرافت کا سامان فراہم کرتا ہے۔ اس ظرافت کا بھی نمونہ دیکھئے!

چار بچے

"الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دعا نے کام کیا"
امی اور ابا نے مل کر میرا کام تمام کیا

ننھی جوگن خدا کی تلاش میں

آج کل پردہ کوئی کرتا نہیں تیرے سوا
چھوڑنے والی ہیں اب امی بھی پردہ لے خدا

بچوں کی توبہ

ہم نے بکری کے بچوں کو کمروں میں نچانا چھوڑ دیا
ناراض نہ ہو امی، ہم نے، ہر شوق پرانا چھوڑ دیا
ڈیڈی کے سوٹ پہن کر، ہم صوفوں پر ڈانس نہیں کرتے
سارے گھر کی بنیادوں کو اب ہم نے ہلانا چھوڑ دیا
دادا ابا کا چشمہ اب بکرے کو نہیں پہناتے ہم
نانا ابا کی لٹھیا کو اب ہم نے چھپانا چھوڑ دیا

اب ہم نے کبھی کھانا کھاکر کپڑوں سے ہاتھ نہیں پونچھے
دیکھو کئی دن سے دھوبی نے رونا چلانا چھوڑ دیا

"انداز بیاں" کے علاوہ ان کے عام رنگ سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی ظرافت کا مواد اردو شاعری کے قدیم اور جدید سرمائے اور قلم سے تحریف کی شکل میں حاصل کرتے ہیں۔

راجا مہدی علی خاں کے یہاں مستقل چھیڑ چھاڑ اور نوک جھونک کی دلچسپ مثالیں ملتی ہیں۔ طاہرہ سلطانہ مخفی اور راجہ مہدی علی خاں کی گرما گرم بحثوں اور نوک جھونک سے دنیائے ظرافت میں بھلا کون ناآشنا ہو گا۔

راجا مہدی علی خاں کی مزاحیہ نظموں میں عورت اور مرد کے باہمی ربط اور جذباتی ہم آہنگی، دلچسپ چھیڑ چھاڑ اور دل لگی کے ذریعہ مسرت حاصل کرنے کی دلچسپ مثال فلرٹ اور کورٹ شپ سے متعلق راجا صاحب کی سدا بہار نظمیں ہیں:۔

راجا مہدی علی خاں اپنے اردگرد بکھری ہوئی مسرت اور شادمانی اپنے قاری کے لئے جمع کرتے ہیں۔ ان کی نظموں کی ہنستی گاتی مترنم دنیا میں آپ کو ہر طرف زندگی اور زندہ دلی کی بہار بے خزاں نظر آئے گی۔

ان کی شاعری کی اس مزاحیہ رو کی ترجمانی " نگوڑا "، " اس سے اور اس سے" "بیوی کی سہیلیاں"، "ہمیں ہماری بیویوں سے بچاؤ"، " دستک نیم شب" مثنوی قہر عشق"، " مانگے کی کتابیں" " مثنوی تاج دین معراج دین "، " ایک جہلم پر"، " پارٹیشن " اور " بنام قاضی الحاجات" وغیرہ میں بہت عام ہے۔ اردو کی مزاحیہ شاعری میں یہ نظمیں ایک خوشگوار اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

راجا مہدی علی خاں کی ظرافت میں عمومیت، سادگی اور کھلنڈرے پن کی تہہ میں شعور کی کارفرمائی اور مقصدیت ہے۔ یہی شعوری مقصدیت ان کے منصب اور

انفرادیت کو جلا بخشتی ہے۔

اپنی اس ظرافت کے سائے میں ان کا نام ہمیشہ روشن رہے گا اور ان کے باغ و بہار اشعار ہماری تھکی، اداس اور بے چین روحوں کو گدگداتے اور ہنساتے رہیں گے۔
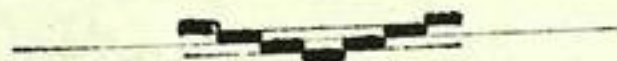
مرزا محمد اقبال

ماچسؔ لکھنوی

ماچسؔ لکھنوی کا اسم گرامی مرزا محمد اقبال تھا۔ ایم۔ ایم۔ اقبال کہلاتے، اور حضرت ماچسؔ کے نام سے مشہور رہتے۔ اپنے آبائی مکان واقع کاظمین گیٹ میں، سنہ ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے آخر دم تک اسی میں رہایش تھی۔

ان کے مورث اعلیٰ نواب سعادت خاں برہان الملک دہلی دربار سے اودھ کی نظامت پر فائز ہوکر فیض آباد آئے تھے۔ یہ سلسلہ نواب وزیر کے حسن انتظام سے شروع ہوکر اودھ کی بادشاہت پر ختم ہوا۔ اودھ کے تیسرے بادشاہ محمد علی شاہ سے ان کا دادھیالی کے علاوہ نانہیالی نسلبۂ نسب بھی ملتا ہے۔

ایم۔ ایم۔ اقبال نے ابتدائی تعلیم و تربیت، اپنے نانا پرنس حکیم مرزا محمد ابراہیم عیشؔ سے پائی۔ عیشؔ لکھنوی محمد علی شاہ کے پوتے تھے۔ ان کا شمار اپنے زمانے کے فارسی اور اردو کے مسلّم الثبوت اساتذہ میں تھا۔ ایم۔ ایم۔ اقبال نے ہائی اسکول تک تعلیم پائی اور ریاستی محکمۂ سیلز ٹیکس سے وابستہ ہو گئے۔

ان کی علالت کا سلسلہ جون سنہ ۱۹۷۰ء میں شروع ہوا۔ ۲۶ر اگست سنہ ۱۹۷۰ء ۸ بجے شب بعارضۂ کینسر وفات پائی اور کربلائے امین الدولہ میں سپرد خاک کئے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ سگارؔ لکھنوی نے تاریخ کہی:

مصرعِ تاریخ ہجری میں یہ لکھ دے اے سگارؔ
ساکنِ خلدِ بریں اقبال ماچسؔ لکھنوی
۱۳۹۰ھ

انہوں نے ۵۲ برس عمر پائی۔ پسماندگان میں ان کی بیوہ، دو لڑکے، اور ایک لڑکی ہے۔ انتقال کے وقت ان کے بڑے لڑکے کی عمر ۴ سال۔ لڑکی کی تین سال۔ اور چھوٹا بچہ محض تین ماہ کا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے بڑے بھائی مرزا محمد عزیز معزز لکھنوی دو چھوٹی بہنیں اور ان کے بھتیجے سگار لکھنوی بقید حیات ہیں۔

ماچس لکھنوی کشیدہ قامت، خوش لباس، جامہ زیب، حساس، محتاط، متین کم آمیز، مہذب، بشاشتہ، نستعلیق، اور خود دار انسان تھے۔

شعر و ادب اور ظرافت کے رموز و نکات پر گہری نظر تھی۔ گفتگو زیادہ تر شعر و شاعری پر کرتے، حافظہ بلا کا تھا۔ اپنے سارے کلام کے علاوہ اساتذہ کا بھی بیشتر کلام ازبر تھا۔

شعر و شاعری کا سلسلہ بچپن میں شروع ہو گیا تھا۔ ۱۷، ۱۸ سال کی عمر سے ہی حضرت آرزو لکھنوی سے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ اُن کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہونے کے بعد انھوں نے اُن سے باقاعدہ علم عُروض پڑھا۔

سولہ سال کی عمر میں سنجیدہ طرحی غزلوں کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کی مگر طبیعت کو ظرافت سے مناسبت تھی۔ اس دوران توپ دروازہ میں ایک مشاعرہ کی طرح تھی ؎

"دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے"

انھوں نے اپنے فطری رنگ میں اس طرح پر طبع آزمائی کی اور بہت کامیاب ہوئے۔ اقبال سے ماچس ہو گئے۔ اور زندگی بھر کامیابی کے ساتھ اس راہ پر کامیابی سے گامزن رہے۔ اس طرح میں اُن کا ایک شعر ملاحظہ فرمایئے۔

"دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے"
حلق تک آ کے جھانکتا کیا ہے

کلام میر اور آرزو سے بے حد متاثر تھے۔ اسی وجہ سے محاورات، زبان اور

شاعری میں صحت، صفائی اور سادگی کا بیحد خیال رکھتے، مزاحیہ انداز میں کچھ قصائد بھی کہے جو بہت مقبول ہوئے۔ نوحے اور سلام میں سوختہ تخلص کرتے

ماچس مرحوم کلام کو بیاض میں محفوظ کرنے یا اشاعت کے لئے بھیجنے کے سلسلہ میں اسے نقل کرنے کو خاصی زحمت سمجھتے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انھیں اپنا کہا یاد رہتا تھا۔ دوسرے شان خط کچھ ایسی تھی کہ اپنی تحریر دوسروں سے اس طرح چھپاتے جیسے مور اپنے پاؤں!

ناسازگاری زمانہ کے سبب انکا مجموعہ کلام نہ شائع ہو سکا۔ اور اگر جلد ہی ان کے کلام کو یکجا کرکے، زیور طبع سے آراستہ نہ کیا گیا، تو خطرہ ہے کہ وہ بیاض یا قلمی دیوان کی شکل میں زیادہ محفوظ نہ رہ سکے۔

ماچس لکھنوی اپنے عہد کے لکھنؤ کی مخصوص، سنجیدہ اور متین ظرافت کے ممتاز نمائندے ہیں۔

ماچس کی شاعری کا آغاز "اودھ پنچ" اور سرپنچ کے ظریفانہ کالموں سے ہوا تھا۔ ظرافت میں یہ ریاض خیرآبادی، عبداللہ ناصر، احمق پھپھوندوی، بوم میرٹھی، حاجی لق لق، شہباز، شوکت تھانوی، مجید لاہوری، شاد عارفی، سید محمد جعفری، اور ذوقی کاکوروی وغیرہ کے ممتاز ہمعصر تھے۔

ماچس لکھنوی نے اپنے دور میں اصلاح ظرافت کی جو خدمت انجام دی وہ اس لئے بھی اہم ہے کہ ان تک آتے آتے ہزل محض پھکڑپن، بھنڈیتی اور ہنسی بن کر رہ گئی تھی۔ جس کے ڈانڈے لطافت اور ظرافت سے زیادہ سوقیت اور رذالت سے مل گئے تھے۔ انھوں نے لکھنوی رنگ ظرافت کو اس کثافت سے بڑی حد تک پاک کیا۔

ماچس لکھنوی کے مزاج میں جو نفاست، متانت، شائستگی اور تہذیب تھی، اس کا پرتو ہمیں ان کے انداز بیان اور ہزل میں بھی ملتا ہے۔ مزاج عام کے پیش نظر

مناسب ہوگا کہ ان کی ہزل کو بجائے ہزل کے مزاحیہ غزل کہا جائے۔

ماچس لکھنوی کی اس ستھری ظرافت نے انہیں اودھ پنچ، سرپنچ اور دوسرے معاصر پنچ اخبارات میں ممتاز جگہ دی، اور شوکت تھانوی کے سرپنچ نے انھیں ظریف الملک کے خطاب سے نوازا۔

معاصر پنچیانہ رسائل وجرائد کے علاوہ ممتاز ادبی رسائل اور اخبارات میں بھی، ان کا کلام نمایاں طور پر شائع ہوتا، اور پسند کیا جاتا۔ جن میں نمکدان، پھلجھڑی، پاک پنچ، انتخاب اور شگوفہ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ماچس مرحوم کا مجموعۂ کلام شائع نہ ہو سکا اور خطرہ ہے کہ کہیں ان کا کلام ضائع نہ ہو جائے۔ لیکن اگر ان کا سارا کلام تلف ہو جائے، تب بھی اُن کا یہ مشہور اور معرکے کا شعر ہمیشہ اُن کا نام زندہ رکھے گا:۔

شیخ آئے جو محشر میں تو اعمال ندارد
جس مال کے تاجر تھے وہی مال ندارد

اسی مزاحیہ غزل کے دوسرے اشعار بھی ملاحظہ فرمایئے

تحقیق کیا اُن کا جو شجرہ تو یہ پایا
کچھ یونہی سی ننھیال ہے ددھیال ندارد

ہے اُس بُت کافر کا شباب، اپنا بڑھاپا
ماضی ہے ادھر گول، اُدھر حال ندارد

ماں باپ، بہن بھائی، سب اُنکے ہیں مرے ساتھ
اب گھر مرا سسرال ہے، سسرال ندارد

اللہ رے ستم وصل کا، جس سال تھا وعدہ
وہ ہوگئے دنیا سے اسی سال ندارد

باچس نہ کہیں نالۂ سوزاں سے لگے آگ

ہوجائے نہ پنڈال کا پنڈال ندارد

شوخی اور ظرافت کے ساتھ اُن کا مشاہدہ بھی بلا کا ہے۔ دیکھئے محبوب سے سرراہ ملاقات۔ اور اُسکی کج ادائی کا کس طرح نقشہ کھینچکر رکھ دیا ہے۔

ملے بھی ہیں، تو اف رے نخوتِ حُسن

سڑک پر آڑے آڑے جا رہے ہیں

روایتی محبوب کے رقیبوں میں، اُسکو پالینے کے سلسلہ میں ہونے والی رسہ کشی کی تصویر دیکھئے:

سب کی کوشش اُن کی پائیں

اتنے لٹیرے اک کنکیا

اردو شاعری کے روایتی عاشق کو خودکشی کا افسانہ یوں بیان کرتے ہیں ؂

جب نہ کچھ بن پڑی دیوانے نے کھاکر افیون

پی لیا تیل چراغِ شبِ تنہائی کا

جب عاشق کے دل کو لگی ہوتی ہے تو انہی کے الفاظ میں:

سوز محبت کے آگے، کیسی مٹی اور کیسا جوتن

اُن کی چھت اور اُنکا صحن منصوری اور دیرہ دون

سنگدل محبوب کی سختیوں کے ایک نئے گوشہ سے یوں پردہ سرکاتے ہیں ؂

کیا بند اُس بُت نے کھانا ہمارا

کہاں اب لگے گا ٹھکانا ہمارا

ہوائے مغربی کے ساتھ، آج کل کی ٹیڈی محبت اور اس کے عبرتناک انجام کی آگاہی دیتے ہوئے کہتے ہیں ؂

عشق کی راہ میں کچھ اور مقامات کیساتھ

اب عدالت کے کٹہرے کا مقام آتا ہے

زمانہ کی ناہمواری اور مسائل کی سنگینی پر بھی ماچس کی گہری نظر ہے۔ اقلیت سے "وفاداری" کے نام نہاد مطالبے کا چیلنج قبول کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

میرے دل کا جب چاہو تم بھی امتحاں لے لو
یہ ٹبیر جیتا ہے ہر وفا کی پالی میں

آزادیٔ وطن کے بعد تعمیرِ وطن کے جو خواب دیکھے تھے اُن کے انجام پر اپنے ایک سیاسی شعر میں، کس شوخی سے، کتنی بڑی بات کہہ جاتے ہیں :

وقت کی خرابی سے سب نکل گئے گندے
جسقدر بھی انڈے تھے دامنِ خیالی میں

ماچس سماجی بدعنوانیوں کا جی کھول کے مذاق اڑاتے ہیں، دودھ میں پانی ملانے کی بدعت پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

ہماری یہ بدقسمتی ہے اگر ہم
نہ ان گھوسیوں کی کریں قدردانی
عمل کرکے جو روز ہم کو بتائیں
یہ دُودھ کا دُودھ پانی کا پانی

اشیاء کی گرانی، اور انسان کی ارزانی کے بارے میں کہتے ہیں :

واہ ری قسمت ! واہ رے دَور
مہنگا آٹا ، سستا خون

تعلیم کی بے وقتی، اور بے روزگاری پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں :

بی۔ اے پاس کیا ہے تو جا !
بیٹھ سڑک پر بیچ بجُون

جاڑے جانے کی پہچان بھی سُنیئے :

نظر آنے لگیں جب سر پہ مچھر
سمجھ لیجیے، کہ جاڑے جارہے ہیں

آج کل کی شاعری اور مشاعروں پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں

ہم اڑاتے ہیں یونہی بے پر کی
شاعری کیا، مشاعرہ کیا ہے؟

لاوڈ اسپیکر پر فلمی گانوں کی بڑھتی ہوئی بوریت کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتے ہیں :

ذرا اپنے کانوں کے پردے بچانا
اگر سُن رہے ہو فسانہ ہمارا

اپنے تخلص سے بڑا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسکی رعایتیں بھی ملاحظہ فرمایئے۔

آپ مہنگے جو ہوگئے ماچسؔ
اس لئے کم جلائے جاتے ہیں

سوزِ غم سے جسم گھل گھل کر ذرا سا ہوگیا
آپ کا بیمارِ غم ماچسؔ کا تنکا ہوگیا

قفس سے جو اک آہ کی ہم نے ماچسؔ
تو خود جل گیا آشیانہ ہمارا

ان کے کچھ اور جستہ جستہ اشعار ملاحظہ فرمایئے : دیکھئے کیا کیا نکتے پیدا کرتے ہیں :

جاکے پانڈے پھر اسی دریو گے آنے کے بعد
پھر وہی کھرے چنے کی کھائی کھپانے کے بعد

ہے وہی فرقِ نمایاں اب تو نیتاؤں میں بھی
قبل آزادی کے، اور آزاد ہو جانے کے بعد
جس طرح بچوں کی تصویروں کے نکلیں اشتہار
اک دوا کھانے سے پہلے اک دوا کھانے کے بعد
ڈومنی تو چل ہی دیگی، گا بجا کر لے کے نیگ
عمر بھر دولہا میاں ناچیں گے اس گانے کے بعد

انسان کے بہکانے کی کھائے تھا قسم
اس واسطے ظالم نے نیا وار کیا
جب شیخ و برہمن سے ہوا دل مایوس
شیطان نے نیتاؤں کو تیار کیا

اگر ایسے حسیں موجود ہیں اے دوست دنیا میں
کہ جس بستی میں جا نکلیں، ہر اک دیوانہ ہو جائے
تو میری جاں! مقرر بھی ہیں کچھ ایسے زمانہ میں
جہاں دو چار تقریریں کریں، ویرانہ ہو جائے

اُف رے جوشِ رقابت! عدو جب ملا
مونچھ کھا کھا کے بل خود کھڑی ہو گئی
اللہ! اللہ! رہِ عشق کی ٹھوکریں
چار دن میں طبیعت ہری ہو گئی
آہِ سوزاں نے ما چس اثر تو کیا
اُن کی صورت تو کچھ سانولی ہو گئی

نظر چراتے ہیں اس طرح دیکھ کر مجھ کو !
کسی کا جیسے کوئی قرض دار ہوتا ہے

— —

گزرے ہیں ایسے وقت کبھی زندگی میں بھی
گیہوں کا لطف آیا ہے بھوسی کھلی میں بھی

ان کی نظموں میں "چاند کا ریڈیو اسٹیشن"، "شکوہ شکر"، "مجھے معلوم نہ تھا"، "مہنگائی" اور "خاندانی منصوبہ بندی" وغیرہ شاہکار ظرافت ہیں۔ یہ نظمیں ان کے گہرے سماجی شعور کی آئینہ دار ہیں۔ اور ان کی تحریفات کا بہت اچھا نمونہ ہیں۔ خاص طور پر ان کی پیروڈی "چاند کا ریڈیو اسٹیشن" جس میں چاند کے پردے میں اسی دنیا کے ریڈیو اسٹیشنوں پر شاعر، ادیب اور فنکار کے ساتھ ہونے والی جوہر شناسی اور بدعنوانیوں پر گہرا طنز کیا گیا ہے۔ فن کار کی نااہل کے مقابلہ میں جس طرح مٹی پلید رہتی ہے اور ادبی جوہر کے مقابلہ میں سفارش کی بیساکھیوں کو جس طور پر دنیائے ادب میں قدم قدم پر ترجیح دیجاتی ہے، اس کا انھوں نے بہت کھل کر مذاق اُڑایا ہے۔

اسی طرح "شکوہ شکر" میں چور بازاری، گرانی اور ذخیرہ اندوزی کو انھوں نے اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اس میں ان کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ ادبی ظرافت اور تیکھے طنز میں زبان و بیان اور تحریف کی شوخیاں، عجب بہار دیتی ہیں۔ اور انکی منظر نگاری کیا کیا کارٹون پیش کرتی ہے۔

"مجھے معلوم نہ تھا" ـــــ ان کی خالص ظرافت کا اچھا نمونہ ہے۔ اس تحریف میں تفنن بھی ہے اور شوخی بھی۔ ان کی تحریفات کے جستہ جستہ اقتباسات آپ بھی ملاحظہ فرمایئے اور لطف اندوز ہویئے :

چاند کا ریڈیو اسٹیشن

ہنسیں گے آپ بھی، جو عرض حال کرتا ہوں
میں خود بھی ہنستا ہوں جسدم خیال کرتا ہوں
یہاں کے شعر و ادب کی بدل گئی جو فضا
مرا تخیل پرواز چاند میں پہونچا
مکاں کرائے کا لیکر وہیں قیام کیا ______
شروع اپنا یہی شاعری کا کام کیا
وہاں کے شعر و ادب کی فضا بھی گندی تھی
وہاں بھی حد سے زیادہ گروپ بندی تھی
جو اہلِ فن تھے، وہ بیٹھے تھے دُم دبائے ہوئے
خوشامدی تھے وہاں بھی فضا پہ چھائے ہوئے
بس ایک روز باصرار ایک دوست مجھے ______
وہاں کے ریڈیو انچارج پاس لے کے چلے
وہ نکلا بنگلے سے اپنے اس آن بان کے ساتھ
ملایا اُس نے بڑا منھ بنا کے مجھ سے ہاتھ
پھر احتیاجِ صفات و ذات آ پہونچی
ادائے رسمِ تعارف کی بات آ پہونچی
جو نوجواں کو تعارف میں پوچھ بیٹھا میں
کہا کہ ان کو الف، لام، میم کہتے ہیں
کہا جو میں نے الف، لام، میم کا مطلب
تو بولے اِن کا تخلص ہے اور کیا مطلب

میں بولا جل کے کہ اُن کی کوئی کتاب نہیں
کہا چھپا تو ابھی کوئی انتخاب نہیں
کہا جو میں نے کہ اچھا جناب شاعر ہیں
کہا یہ اُس نے بڑے کامیاب شاعر ہیں
—— مجھے تو اُن کے ہر اک شعر سے محبت ہے
مری نگاہ میں ان کی بہت ہی عزت ہے

کہا یہ دوست نے میرے کہ خیر سنئے جناب
جنہیں میں لایا ہوں انکا بھی کچھ نہیں ہے جواب
خدا کے واسطے اک چانس انکو بھی دیجے
مشاعرے میں کبھی ان کو بھی بُلا لیجے
تو مسکرا کے یہ بولا . کہ ہاں ضرور ! ضرور !
تمہاری بات ٹلے ہم کو یہ نہیں منظور
کبھی ایک بھی معیار پر جو آئیں گے
تو ریڈیو پہ ضرور ان کو ہم بلائیں گے
پھر اسنے مجھ سے یہ پوچھا جناب ! نام ہے کیا؟
کہا جو میں نے کہ اقبال نام ہے میرا
اُچھل کے بولے کہ اخاہ . ڈاکٹر اقبال
زمیں کے شاعر پنجاب یعنی سر اقبال !

—— رہی کب آپ کی ہستی کمال سے خالی
لکھے گا کون بھلا مسدس حالی

کہا یہ میں نے کہ جی میں نہیں ہوں سر اقبال
بہ اتفاق مرا نام ہے مگر اقبال

وہ بولا ہنس کے چھپا کچھ کلام ناموزوں

میں بولا جھینپ کے کہ ناواقفِ عروض میں ہوں

کہا یہ کیا ہے کہ جس سے نہیں ہوں میں واقف

کہا یہ میں نے الف، لام، میم سے ہیں واقف

تب اُس نے اُن سے یہ پوچھا عروض کیا ہے بلا

وہ بولے ہنس کے کہ اقبال کا وہی شکوہ

کہا جو فن سے میں نے بڑی ہے معلومات

اکڑ کے بولے، یہ ہے اپنے اپنے ذوق کی بات

—— گیا وہ دور کہ برسوں میں ہو نظر پیدا

اب آٹھ روز میں ہوتا ہے دیدہ ور پیدا

کہا پھر اس نے کہ ہے ریڈیو پہ کوئی عزیز؟

کہا یہ میں نے یہ معیار کی ہے کوئی چیز؟

کہا ہمارے کلرکوں سے رسم و راہ نہیں؟

کہا یہ میں نے کہ اتنا میں کم نگاہ نہیں

کہا یہ اس نے کہ قبضہ میں ہے کوئی اخبار

کہا یہ میں نے کہ یہ کون سا ہوا معیار

کہا کہ تبصرہ بازوں سے ہے شناسائی؟

کہا یہ میں نے کہ وہ بھی نہ مجھ کو راس آئی

کہا جب اُس نے کہ کرتے تو ہوگے میٹنگ شی؟

کہا یہ میں نے کہ غالب تو ہو سکے نہ ولی

وہ بولا آپ سے واقف تھے کیا جواہر لال؟

کہا یہ میں نے کہ ایسے نہ تھے مرے اعمال
کہا ــــ کہ رادھا کرشنن سے تھی شناسائی
کہا یہ میں نے کہ یہ صدر کی ہے رُسوائی
کہا جب اُس نے کہ ذاکر حسین جانتے ہیں
کہا یہ میں نے کہ کیوں آپ سب کو جانتے ہیں؛
پھر اُس نے پوچھا: کہ روٹی پہ کوئی نظم کہی؟
کبھی کسی کی لنگوٹی پہ کوئی نظم کہی؟
ـــــــ قلم اُٹھایا کبھی اسپِ ناز کے سُم پر
کہی ہے نظم کبھی کوئی اونٹ کی دُم پر

کہا جو میں نے جناب اسمیں شاعری کیا ہے
کہا یہ اُس نے میاں اور زندگی کیا ہے؟
اماں! اُنہیں کے مذاقِ سلیم کو دیکھو
نہ جاؤ اور الف لام میم کو دیکھو
انھوں نے نظم کہی ہے خمیری روٹی پر
اک ان کا گیت ہے مزدور کی لنگوٹی پر
سماں گھسیٹا جو اسیشین کے پلّے کا
تو مجھ کو دھوکا ہوا شیخ جی کے بلّے کا
مطالعے میں گزاروگے تم اگر دن رات
کہیں نہ پاؤگے اتنے حسین تشبیہات
مثال دے جو ٹماٹر کی سُرخ گالوں کو
جلی سوئیاں کہے جو سیاہ بالوں کو

کہے جو آنکھ کو دو آنسوؤں کے پرنالے
بتاؤ پوچھیں نہ کیوں اُسکو ریڈیو والے

کہا جو میں نے یہ رحمت ہیں آپ سب کے لیے
بنے ہوئے ہیں جو قہر خدا ادب کے لیے
غضب ہے! میری مذمت کو بھی ثنا سمجھے
کہا کہ کہتے ہو سچ جاہل اس کو کیا سمجھے
پھر اس کے بعد جو ہو گا، میں جانتا تھا یہی
وہی ہوا کہ یہ کی اُس نے معذرت خواہی
ہمارے ایک بھی معیار پر جو آپ آتے
ضرور آپ کو ہم ریڈیو پہ بُلواتے

ماچس لکھنوی کے کلام میں خاصے کی چیز ان کے وہ منظوم خط ہیں جو انھوں نے پنڈت جواہرلال نہرو، سروجنی نائیڈو، حافظ محمد ابراہیم اور صدیق حسن مرحوم وغیرہ کے نام لکھے تھے۔ اور جو ان کی ادبی سیاسی اور سماجی بصیرت کے آئینہ دار تھے۔

ماچس لکھنوی کے یہ خطوط اردو کے مختلف طنزیہ اور مزاحیہ رسائل کی جلدوں میں محفوظ ہیں۔

ماچس لکھنوی کے کلام میں ہمیں جیسا معیاری اور ستھرا طنز ملتا ہے اور انھوں نے جس طور پر ہزل کو مانجھ کے طنزیہ اور مزاحیہ غزل کے روپ میں پیش کیا، اس کے پیش نظر انہیں اس دور کا مصلح ہزل ظرافت کی تاریخ میں ہمیشہ تسلیم کیا جائے گا۔

لکھنؤ کی ظریفانہ شاعری کا ایک دور اُن پر ختم ہو گیا۔

ماچس لکھنوی کا نام ممتاز مزاحیہ اور طنزیہ شاعر کی حیثیت سے ظریفانہ ادب کی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

عبداللہ ناصر کی یاد میں

اودھ پنچ "(دورثانی) کے شعرا میں عبداللہ ناصر ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے "سرپنچ" "اپنچ" پنچوچوں" "دہلی پنچ" "پنجاب پنچ" "لاہور پنچ" "علی گڈھ پنچ" "انکشاف" "شیرازہ" اور دوسرے ظریف اخبارات میں ان کا طنزیہ اور مزاحیہ کلام بڑی دھوم دھام سے شائع ہوتا تھا۔

"اودھ پنچ" سے "انقلاب بمبئی" تک مزاحیہ شاعری میں عبداللہ ناصر کے یہاں ہمیں وہی صحت مندرجانات ملتے ہیں جن کو اکبر الہ آبادی، اور ظریف لکھنوی کی دین کہنا مناسب ہوگا۔

ان کے "اودھ پنچ" کے معاصرین میں ظریف لکھنوی، شہباز بلند پرواز، ہندی ندیم المست شاہ پوری، نشتر، خستہ جگر، خفاش کرمانی، سرکوب فتح پوری، سرشار کسمنڈوی قمر گیاوی، دولہا گیاوی، زار ہند، ریاض خیر دلی، ہوش جردلی، اصغر شاہ پوری، اخگر اور خیر درھنگوی اور بعد کے دور میں اکبر لاہوری، خضر تیمی، شوکت تھانوی، سید محمد جعفری حسرت، سالک، لق لق، مجید لاہوری، ظریف جبلپوری، اسعد ملتانی، رئیس امروہوی، شہباز امروہوی، انجم مانپوری، شوق بہرائچی، شاد عارفی، واہی اور شاہد صدیقی وغیرہ کی ہمیشہ ایک اہمیت رہے گی۔

عبداللہ ناصر ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے اور ۸ رستمبر ۱۹۶۵ء ۳ بجے شب کو انتقال ہوا اس طور پر انھوں نے ۶۳ برس کی عمر پائی۔ تقریباً ۲۰ سال کی عمر سے مزاحیہ شاعری شروع کردی تھی کیونکہ ۱۹۲۲ء کے مزاحیہ اخبارات میں ان کا کلام ملتا ہے اور تقریباً ۱۹۲۵ء سے عام طور پر ظریف رسائل میں ان کا مزاحیہ کلام یا اس کی نقلیں ملنے لگتی ہیں۔ ان کی مقبولیت کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ عام طور پر اُن کی ایک ہی قسم کی چیزیں بیک وقت متعدد معاصر اخبار

و رسائل میں ملتی ہیں۔

معلمی کے پیشے کے ساتھ اُنھوں نے خاموشی کے ساتھ اپنے اِس شوق کی بھی ہمیشہ آبیاری کی، اودھ پنچ "کے" قطعات "اور نظموں سے "انقلاب" کے تازیانے" تک ان کا یہ رنگ ہمیشہ قائم رہا۔

عبداللہ ناصر نے تقریباً ۴۳ سال تک چمنِ ظرافت کی آبیاری کی اور اس میں انواع و اقسام کے گل بوٹے کھلائے۔

عبداللہ ناصر کی ظریفانہ شاعری خندہٗ محض نہ تھی اس میں ہمیشہ انھوں نے اصلاح کا پہلو اپنے پیشِ نظر رکھا۔ اودھ پنچ کے لکھنے والے ہمیشہ سماجی اصلاح اور واضح مقصدیت پیش نظر رکھتے تھے۔ اس اعتبار سے عبداللہ ناصر اودھ پنچ کے شعراء میں اکبر اور ظریف سے زیادہ قریب ہیں۔

اُن کے موضوعات میں ہمیں نصف صدی کے قدیم اور جدید موضوعات کی رنگا رنگی اور گہری مقصدیت کی چھاپ ملے گی۔ اس کی جھلک بھی دیکھیے۔

پیٹ امام

اصلاح کا خیال نہ تنظیم کی ہے فکر
گو اس کے ہاتھ مقتدیوں کی لگام ہے
دن رات حلوے مانڈے کی جو سوچتا رہے
وہ پیش امام کاہے کو ہے پیٹ امام ہے

روزہ

کان، ناک، ہاتھ، پاؤں اور منہ کا
ہے یہ ممکن ہوں سدا روزہ
اس پرستان بمبئی میں مگر،
غیر ممکن ہے آنکھ کا روزہ

شیر افگن

کل تلک شیر افگنی میں جس کو حاصل تھا کمال
آج نکلا گھر میں ایک چوہا تو وہ گھبرا گیا
اُس میں یہ جرات کہاں آنکھیں ملائے شیر سے
آئینے میں اپنی ہی آنکھوں سے جو شرما گیا

"نئی تعلیم" کی افادیت کے بارے میں ان کے یہاں بھی شک وشبہ ملتا ہے تعلیم کے سرکاری اور دفتری ہونے کا اُن کو بھی احساس ہے یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ تعلیم سب کچھ بنا دیتی ہے مگر بس "آدمی" نہیں بنا پاتی۔

کالج

نکلتا ہے کلرکوں کا یہاں سے ایک بڑا لشکر
نکلتے ہیں یہیں سے ڈاکٹر، انجینئر، لیڈر
یہیں سے ایکٹر اور ایکٹریسیں بھی نکلتی ہیں
نکلتا ہے گر کالج سے کوئی آدمی بنکر؟

عبداللہ ناصر کے یہاں جدید موضوعات کی فراوانی ہے۔ مکانوں کی قلت، پردہ اور بے پردگی، ٹیڈی ازم اور عشق بازی، بے جا آزادی وغیرہ پر بھی ان کے یہاں بہت کچھ مل جائے گا۔

سٹرک چھاپ مجنوں

انھیں بھیج دو جیل، کوڑے لگاؤ
جو چاہو سزا دو، نہیں کوئی شکوہ
سٹرک چھاپ مجنوں مگر کم نہ ہوں گے
کہ آزاد ہیں ایکٹریس چھاپ لیلیٰ

فارن منسٹر

وہ ہوم منسٹر تھیں تو گھر میں تھی اک رونق
لڑتی تھیں کبھی مجھ سے سُنتیں کبھی صلواتیں
فارن منسٹر ہیں جس دن سے میری بیگم
تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں

آپ اپنی لڑکیوں کو مردانگی سکھائیں
فٹ بال اور ہاکی کرکٹ انھیں کھلائیں
پتلون پہنوائیں اور بال بھی کٹائیں
سَو سَو جتن سے ان کی نسوانیت مٹائیں
لیکن میں آپ سے یہ اک بات پوچھتا ہوں
کل باپ وہ بنیں گی، یا وہ بنیں گی مائیں

نوجوانوں کی منطق

رہے گا حسن پر کنٹرول جب تک
نگہہ کی چور بازاری رہے گی
نقاب و پردہ کی رسموں کے ہوتے
رہے گی تاک جھانک اپنی رہے گی

نئی تہذیب کے کچھ اور نمونے بھی دیکھئے اور ان کے مطالعے اور مشاہدے کی داد دیجئے ۔

فرمائش

بے تکلف دوست سے ملنے گیا میں اُس کے گھر
اُس سے میں نے ٹھنڈا پانی مانگا پینے کے لئے

"آدمی آنے دو" سُنکر میں نے یہ اُس سے کہا

آج تم ہی بن نہ جاؤ آدمی میرے لئے

واسطہ

خدا کے نام پر پھٹکا نہ کوئی

نہ جھانکا ایک بھی نامِ نبی پر

کیا اعلان جب نرگس کا میں نے

ہزاروں آگئے اِس ڈگڈگی پر

پلے بیک سنگر

وہ گانے جن کو سنکر تم کو اکثر وجد آیا ہے

جنھیں گانا نہیں آتا انھوں نے ان کو گایا ہے

یہ ہیں پلے بیک سنگر کی کرشمہ سازیاں ناصرؔ

کہ جس نے چیل اور کوؤں کو بھی بلبل بنایا ہے

بناسپتی نوجوانی

اس پر تعجب آپ کو ہونا نہ چاہئیے

فی گھنٹہ ایک میل اگر نوجواں چلے

پوڈر کا دودھ، ڈالڈا گھی کے ہیں یہ مریض

اتنا بھی گر چلے تو بہت ناتواں چلے

اور عبداللہ ناصرؔ کا یہ مشہور شعر تو شاید آپ نے بھی سنا ہوگا

زبردستوں سے جب پڑتا ہے پالا زیردستوں کا

خطائیں ماننی پڑتی ہیں اپنی بے خطا ہوکر

تقریباً نصف صدی کے اس سرمایہ کے کھنگالنے پر بہت سے گوہرِ آبدار برآمد ہوئے

سکتے ہیں۔ جن میں اخباری دنیا سے متعلق رہنے کی وجہ سے صفائی ہے اور کثرتِ مشق کے سبب ایک قسم کا نکھار اور خوشگواری ملتی ہے۔

اُردو کی مزاحیہ شاعری میں عبداللہ ناصر کے اس مزاحیہ کلام کی ہمیشہ ایک اہمیت رہے گی۔

اُن کے مزاحیہ قطعات میں جن وقتی اور ہنگامی کیفیات کا احاطہ کیا گیا ہے ان کا ہماری سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی سے بڑا گہرا تعلق ہے۔

"اودھ پنچ" کے ایک اہم شاعر کی حیثیت سے وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے اور ان کی مزاحیہ شاعری اور باغ و بہار تحریفات کی تازگی سدا بہار رہے گی۔